شمس الہدیٰ دریابادی
فکری زاویے
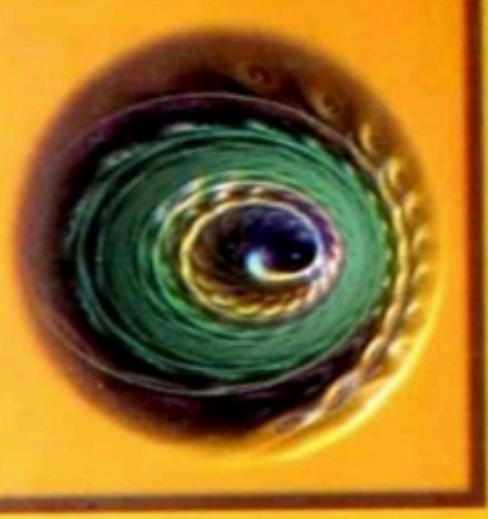
فکری زاویے

فکری زاویے

شمس الہدیٰ دریابادی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

انتساب

ان تمام حضرات کے نام

جو اس مصروف دنیا میں مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں۔

___ شمس الہدیٰ دریابادی

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کچھ مضامین کے بارے میں

یادش بخیر! میں یو پی کے شہر بستی میں خیر انٹر کالج کا طالب علم تھا کہ اردو کے ایک استاد محترم نے مولانا آزاد پر ایک مضمون لکھنے کا حکم دیا، میں نے حامی بھر لی مگر قلم لیکر بیٹھا تو لاکھ کوشش کے باوجود کچھ بھی لکھنے کی جسارت نہ کر سکا۔ استاد محترم کی طرف سے بار بار تقاضہ ہوتا رہا بالآخر مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ بعد میں اس پر غور کرتا رہا کہ یہ ناکامی کیوں ہوئی۔ یہی سمجھ میں آیا کہ مجھے لکھنا نہ آتا تھا۔ مگر کیوں؟ دراصل میں سائنس کا طالب علم تھا ہمارے وقت میں یو پی کے اسکول و کالج کے تعلیمی نظام میں یہ ستم ظریفی تھی کہ اگر کوئی سائنس کا طالب علم ہے تو اردو ادب کا پرچہ نہیں پڑھ سکتا تھا حالانکہ ہندی کے لئے پابندی نہیں تھی۔ اس وقت صورتحال کیا ہے مجھے علم نہیں۔ سہ لسانی فارمولا پر عمل ہو جاتا تو شاید بات نہ بگڑتی۔ واقعہ یہ ہے کہ سہ لسانی فارمولا میں جو مادری زبان کی گنجائش فراہم کی گئی ہے اس سے محروم کرنے کے لئے یو پی کے اسکولوں میں اردو کے بجائے سنسکرت پڑھائی جاتی ہے یہ اکثریت کی جبریت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور حیرت اس بات پر ہے کہ اردو والوں نے اسے بڑے اطمینان سے قبول کر لیا نتیجہ یہ ہے کہ اردو مشاعروں میں شعراء، دیوناگری رسم الخط میں اشعار لکھ کر سناتے ہیں۔ بات کہاں سے کہاں چل پڑی خیر میں طالب علمی کے دور کی بات کر رہا تھا۔

گریجویشن کے لئے میں لکھنؤ کے کرسچین کالج آ گیا۔ مگر اس مرتبہ زبان و ادب کے طالب علم کی حیثیت سے یہاں حوصلہ ملا اور کالج کی سالانہ میگزین "کالیجین" میں "جہیز سماج کا کینسر" عنوان سے میرا پہلا مضمون شائع ہوا۔ بی اے کا طالب علم تھا، بڑی خوشی ہوئی، ایک طمانیت کا احساس ہوا

کہ میں بھی کچھ کچھ لکھ سکتا ہوں۔ دراصل اپنی بات اور فکر و خیالات کو دوسروں تک پہنچانے بلکہ شریک کرنے کے لئے تحریر ایک انتہائی موثر ذریعہ ہے۔ اسی دوران بستی کے ماہانہ رسالہ ''نقوشِ حیات'' میں کئی مضامین شائع ہوئے۔ تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی آگیا۔ یہ ۱۹۹۲ء کا سال تھا۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے دوران زندگی کا ایک بڑا اور اہم حصہ یہاں پر گذرا۔ جے این یو کے ماحول کے دیگر پہلوؤں کو صرف نظر کرتے ہوئے میں نے یہاں کی علمی فضا سے یقیناً بھرپور استفادہ کیا۔

تحقیق کے لئے میرا موضوع ''قدیم دہلی کالج'' ٹھہرا، مولوی عبدالحق اور مالک رام کی دو مختصر کتابوں کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑی دشواری سامنے آئی کہ بہت تلاش کے بعد بھی مطبوعہ مواد اتنا حاصل نہ ہوسکا کہ کام کو آگے بڑھایا جائے۔ حتی کہ ماسٹر رام چندر، منشی ذکاء اللہ، امام بخش صہبائی، مسٹر ٹیلر، ڈاکٹر اشپرنگر، مسٹر بترو، مولوی مملوک علی نانا توی، مولوی کریم الدین پانی پتی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد وغیرہ کو چھوڑ کر بقیہ افراد سے ہم بہت کم ہی واقف ہیں جب کہ دہلی کالج سے وابستہ افراد کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنہوں نے سائنسی، سماجی، سیاسی علوم نیز ادبی اور صحافتی خدمات کے ساتھ ساتھ تراجم کا بیش بہا کارنامہ انجام دیا۔ مجھے زیادہ تر مواد ہندوستان کے مختلف کتب خانوں، آرکائیوز اور میوزیم میں مخطوطات کی شکل میں دستیاب ہوا۔ برٹش لائبریری لندن میں بھی یقیناً بہت کچھ ہوگا۔ میرے دوست جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ سیاسیات کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نوید کی نشاندہی پر میں فصیل بند دہلی شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں ایک غیر معروف مگر اہم شخصیت سے معلومات حاصل کرنے پہنچا تو دہلی کالج سے متعلق انہوں نے جہاں بہت ساری باتیں بتائیں وہیں پر یہ بھی ذکر کیا کہ ویانا یونیورسٹی آسٹریا کی شعبہ تاریخ کی پروفیسر ''اِبا کوچ'' جب اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں دہلی آئیں تو اس وقت انہوں نے یہ اطلاع دی تھی کہ دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر کی ذاتی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ''اشپرنگرس کلکشن'' نام سے ویانا یونیورسٹی میں موجود ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ڈاکٹر اشپرنگر آخری وقت میں یورپ لوٹ گئے تھے اور جاتے ہوئے بڑی تعداد میں کتابوں و مخطوطات کا ذخیرہ بھی لے گئے اگر وہاں تک رسائی ہو تو بہت ممکن ہے کہ دہلی

کالج سے متعلق مزید کچھ چیزیں حاصل ہو جائیں بہر حال اتنی لمبی تمہید باندھ کر میں نے آپ کو جو پریشان کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب میں سرفہرست دونوں تحقیقی مقالوں کے پس منظر سے آگاہ کر سکوں۔

دہلی کالج میں تین فکری زاویے یا دوسرے لفظوں میں مذہبی رویے پروان چڑھ رہے تھے ایک رویہ وہ تھا جو مشرق و مغرب کے تہذیبی اختلاط و علمی ارتباط کے نتیجہ میں مذہب کی نئی توضیح و تشریح کر رہا تھا جس کی نمائندگی ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی کریم الدین پانی پتی اور منشی ذکاء اللہ وغیرہ کر رہے تھے۔ دوسرا رجحان وہ تھا جو مذہب کو اپنی جڑوں کی طرف واپس لے جانا چاہتا تھا۔ یعنی ان کا مقصد احیائے دین تھا اور عجیب بات ہے کہ دہلی کالج میں رہتے ہوئے انگریزوں سے نفرت ان کی سرشت میں داخل تھی یہ لوگ ولی اللہی فکر کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس فکر کے قابل ذکر لوگوں میں مولوی مملوک علی نانوتوی، مولوی ذوالفقار علی دیوبندی، مولوی قاسم نانوتوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی کے نام شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ''مدرسہ دیوبند'' اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ تیسرا وہ مذہبی رویہ ہے، جو عیسائیت سے متاثر ہو کر اپنا آبائی مذہب ترک کر کے خود عیسائی بن بیٹھے۔ ان میں ماسٹر رام چندر، ڈاکٹر چمن لال اور مولوی عماد الدین پانی پتی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اس مطالعہ کے دوران مجھے یہ بار بار انکشاف ہوا کہ حکومتی سطح پر عیسائی مبلغین کی پوری سرپرستی کی جاتی تھی بلکہ برطانوی حکومت کی پالیسی کا ایک حصہ تبلیغ عیسائیت بھی تھا۔ دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر مینگلس نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

> ''قدرت کی مہربانی سے ہندوستان جیسا عظیم ملک برطانیہ کو ملا ہے تا کہ عیسائی مذہب کا پرچم ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرا سکے۔ ہر شخص کو جلد از جلد تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں اپنی تمام طاقت صرف کر دینی چاہیئے''
>
> (B.L. Grover History of Modern India. P. 253)

اسی طرح میجر ایڈورڈس نے کہا تھا کہ ہندوستان پر ہمارے قبضہ کا آخری مقصد ملک کو عیسائی

بنانا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے تربیت یافتہ عیسائی مشنریوں کو حکومت نے میدان میں اتارا۔ لہٰذا اس وقت بین المذاہب مناظروں کا ہونا بدیہی امر تھا۔ ماسٹر رام چندر اور مولوی عماد الدین پانی پتی جیسی شخصیتوں کے عیسائی بن جانے کے واقعہ نے مجھے عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرنے پر مجبور کیا۔ پورا ملک تو چھوڑیے صرف آگرہ میں چند سالوں کے اندر ان مشنریوں کی کیا کیا سرگرمیاں رہی ہیں۔ پادری فنڈر کو جس طرح انہوں نے میدان میں اتارا اس کا جائزہ میں نے اپنے مقالے ''مشنریاں، عیسائیت اور ردعمل'' میں لیا ہے۔ یہ جون ۲۰۰۰ء میں دیوبند کے ماہانہ رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوا تھا۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان مناظروں کی وجہ سے اردو زبان کو یہ فائدہ پہنچا کہ اکثر مناظرے اردو میں ہوتے تھے اور بعد میں اسے کتابی شکل دے کر شائع کر دیا جاتا تھا اس طرح مناظراتی ادب اُبھر کر سامنے آیا جس پر کئی جہتوں سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

دہلی کالج کی علمی وفورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات سے تو ہم بھی واقف ہیں۔ جب ہم اردو نثر کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن پاک یا دیگر دو چار مذہبی کتابوں کے علاوہ اکثر علماء کی نثری خدمات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج سے چل کر خطوط غالب پھر سرسید تحریک پر آ جاتے ہیں۔ حالانکہ دکن، دوآبہ، روہیل کھنڈ، اودھ اور عظیم آباد کے خطوں میں علماء کی سینکڑوں تصانیف ملتی ہیں اگرچہ اس کا موضوع مذہب ہے مگر زبان کے ارتقاء میں ان کا جو حصہ ہے اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ مقالہ ''علمائے روہیل کھنڈ اور اردو نثر'' میں تفصیل سے میں نے ۱۸۵۷ء سے قبل کی تصانیف کا جائزہ لیا ہے اسے پڑھ کر آپ دیگر خطے کے علماء کی خدمات کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ مقالہ دہلی کے سہ ماہی ''رسالہ جامعہ'' کے شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔

۲۰۰۱ء کا سال تھا کہ مشہور فلمی نغمہ نگار اور انقلابی شاعر مجروحؔ سلطان پوری کا ممبئی میں انتقال ہوا۔ میں جے این یو میں ریسرچ اسکالر تھا چند اسکالروں نے یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ''ایک تعزیتی پروگرام منعقد کیا جس میں اپنی اپنی تحریریں پیش کیں۔ مجروحؔ کا تغزل عنوان سے میری بھی طالب علمانہ کوشش تھی۔ اس تحریر کو اردو اکیڈمی دہلی کا رسالہ ایوان اردو نے مئی ۲۰۰۱ء کے شمارے میں شائع کر دیا۔

ہندوستان کے تعلیمی نظام، مسلمانوں کے تشخص اور دیگر ملی خدمات کے لئے مورخ سرسید مرحوم اور مولانا قاسم نانوتوی کی کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا جن کی یادگار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دارالعلوم دیوبند کی شکل میں آج بھی موجود ہے ان دونوں اداروں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئے یہ ایک الگ موضوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیشتر افراد کے ذہنوں میں یہ بات ہے کہ سرسید مرحوم اور مولانا قاسم نانوتوی کے درمیان کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ شدید اختلاف تھا۔ یہ بات سچ ہے کہ دونوں کی فکر الگ ہے۔ کام کرنے کا میدان علیحدہ ہے۔ ایک کی نظر میں مسلمان پہلے ہیں تو دوسرے کی نظر میں اسلام۔ ایک مسلمانوں کی معاشی بدحالی، سماجی بُرائی، اخلاقی پستی اور سیاسی زوال اور ان تمام کے سدباب اور جدید تعلیم کے فروغ کی بات کرتے ہیں تو دوسرے ہندوستان میں دین کی بقا، اسلامی شعائر، ملی تشخص اور ملک کو مغربی استعماری قوتوں سے نجات دلانے کی بات کرتے ہیں اس کے باوجود دونوں میں جو مشترک چیز ہے وہ ہے ''اخلاص'' یہی وجہ ہے کہ وہ حضرات ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے کام کو مستحسن نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ دیوبند اور علی گڑھ ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ سرسید مرحوم پر جو رکیک حملے ہوئے کفر کے فتوے صادر ہوئے اس میں علمائے دیوبند کا دور دور تک تعلق نہیں ہے۔ کتاب میں شامل مضمون ''سرسید مرحوم اور مولانا قاسم نانوتوی (ایک دوسرے کی نظر میں)'' کے ذریعہ دونوں احباب کے تعلقات اور اس کی نوعیت کو میں نے جاننے کی کوشش کی ہے۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے شعبہ اردو کے اولین ادبی مجلّہ ہماری آواز میں یہ مضمون شائع ہوا تھا یہ سن ۲۰۰۳ء کی بات ہے اور اس سال سرسید کے یوم پیدائش کے موقعہ سے شعبہ اردو نے سرسید مرحوم پر ایک سمینار منعقد کیا تھا۔ اس سمینار میں ''عہد نو میں سرسید کی معنویت'' عنوان سے پرچہ پڑھا تھا۔ جو اس کتاب میں شائع ہے۔ سرسید نے اپنی اصلاحی کوششوں کے ذریعہ جن معاشرتی بُرائیوں اور ذہنی جمود و تعطل کی بات کی ہے اور اسے دور کرنے کے جو اصول پیش کیے ہیں آج بھی اس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جب کبھی بھی بچوں کے ادب کی بات آئے گی ہمیں اسماعیل میرٹھی ضرور یاد آئیں گے۔ انہوں نے بچوں کے ذہنوں کے اعتبار سے پانچ حصوں پر مشتمل جو درسی کتاب کی سیریز تیار کی اس میں

تاریخی، زراعتی، طبعی، اخلاقی اور حفظان صحت وغیرہ سے متعلق موضوعات ہیں۔ کردار و واقعات بھی ایسے ہیں کہ جو بچوں کی سیرت سازی میں مؤثر ثابت ہوں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۵۷ء تک اس کے ۱۹۲ ایڈیشن نکل چکے تھے اس پر میں نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا جو ماہنامہ ''نیا دور'' کے شمارہ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔

ماسٹر رام چندر ایک ایسا نام ہے جو واقعی عبقری تھا، پیشہ سے معلم، ریاضی کا ماہر، اردو کا مخلص، اردو صحافت کا معمار، تحقیق و تنقید کا جویا، ادب اور ادیب و شاعر کا محتسب، آبائی مذہب سے متنفر، عیسائیت کا پرستار، اور لندن تک شہرت رکھنے والا غیر معمولی شخص ہی ماسٹر رام چندر ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالب آسان اور سادہ نثر کی طرف جو متوجہ ہوئے اس میں ماسٹر رام چندر کی تحریک کا بڑا دخل ہے۔ بہر حال ڈاکٹر محمد فیروز سابق صدر شعبہ اردو ذاکر حسین کالج کی فرمائش پر میں نے یہ مضمون لکھا جسے کالج کے سالانہ ادبی مجلّہ ''فکر نو'' میں شامل کیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا مگر تقسیم کے ساتھ۔ اس کی ضرب سب سے زیادہ اردو پر پڑی جب کہ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ آزادی کی روح پھونکنے، حُریت کا جذبہ بیدار کرنے اور بالآخر ملک کو غلامی سے نجات دلانے میں اردو زبان و ادب کا جو کردار ہے ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی پھر دیکھئے یہ ستم ظریفی بھی خوب ہے کہ آزاد ہندوستان میں ہر سطح پر جس زبان کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا اور حقوق سے محروم رکھا گیا وہ اردو ہی ہے۔ ریاستوں کی تقسیم زبان کی بنیاد پر ہوئی تو اردو کے حصہ میں کوئی صوبہ نہیں تھا۔ ملک آزاد ہوا کانگریس نے اقتدار سنبھالا مولانا آزاد وزیر تعلیم بنائے گئے اس میدان میں ان کی کیا کیا خدمات ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اردو کے فروغ اور تحفظ کے لئے مولانا آزاد نے جو کام انجام دیئے وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اربابِ اقتدار کے اندر ہی ایک طبقہ ایسا تھا جو مسلسل اردو کو زِک پہنچانے کے درپے رہتا تھا وہ لوگ ہندوستانی پارلیمنٹ میں بھی کوئی ایسا موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے جس کے نتیجہ میں اس زبان کے تئیں نفرت بڑھے اور جذبات بھڑکیں۔ اس زمرے کا ایک مشہور نام ہے ''پرشوتم داس ٹنڈن'' چنانچہ ایک موقعہ پر پارلیمنٹ میں مولانا آزاد اور ٹنڈن جی کا مباحثہ ہوا جس میں مولانا کا وقار اور

طمطراق قابل دید تھا۔ یہ تمام تفصیل میں نے اپنے مقالے ''مولانا آزاد پرشوتم داس ٹنڈن اور اردو'' میں پیش کیا ہے اردو یونیورسٹی کے ایک نیشنل سمینار میں ۱۱رنومبر ۲۰۰۵ء کو یہ مقالہ پڑھا گیا تھا۔

چند سال قبل ماریشس جانا ہوا تھا، راجدھانی ''پورٹ لوئی'' میں ''اردو انسٹی ٹیوٹ'' نام سے ایک ادارہ ہے۔ اس وقت ادارہ کے چیرمین جناب عنایت حسین عیدن تھے۔ وہ ماریشس یونیورسٹی کے ''مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ'' (MGI) میں صدر شعبہ اردو بھی رہ چکے ہیں۔ پورٹ لوئی کا اردو انسٹی ٹیوٹ ''جامعہ اردو علی گڑھ'' کے امتحانات بھی کراتا ہے۔ ماریشس میں اردو سیکھنے کا یہ ایک اہم ادارہ ہے۔ میری دریافت پر عیدن صاحب نے اس کے قیام اور مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ عبدالوہاب فندن صاحب نے ۱۹۵۷ء میں اسے قائم کیا تھا جس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ مضمون ''ماریشس میں اردو کا ایک خاموش خادم'' میں آپ ملاحظہ فرمائیے۔ میرٹھ کا ادبی مجلہ ہماری آواز نے اسے شائع کیا تھا۔

ہندوستان کا چھوٹا سا قصبہ ''دیو بند'' کم از کم دو وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے ایک ''دار العلوم'' دوسرے اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت۔ اگر چہ زیادہ تر مذہبی موضوعات نیز مدارس کی درسی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ لیکن اس وقت صورتحال یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں اردو کتابوں کی طباعت اور فروخت کے اعتبار سے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ روزانہ اور ہمہ وقت سینکڑوں پریس کتابیں چھاپ رہی ہیں اور لاکھوں کتابیں ہندو بیرون ہند آرڈر پر بھیجی جا رہی ہیں۔ میرے اندر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ دیو بند کے ناشرین سے انٹرویو لے کر اس بارے میں مزید کچھ معلومات حاصل کروں۔ چنانچہ کچھ دلچسپ حقائق میرے سامنے آئے جسے میں نے سپرد قلم کیا۔ شکر گذار ہوں جناب شاہد علی خان کا جنھوں نے اسے مئی ۲۰۰۶ء کے کتاب نما میں ''اردو طباعت و اشاعت میں دیو بند کا حصہ'' عنوان سے مہمان مدیر کے کالم میں جگہ دیدی۔

دسمبر ۲۰۰۶ء میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے غالب پر ایک بین الاقوامی سمینار کرایا تھا۔ میں نے اس موقعہ پر ایک پرچہ پڑھا، جس کا عنوان تھا۔ ''انقلاب ۱۸۵۷ء: غالب کی نظر میں'' ہم غالب کو ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ فارسی زبان پر بھی انہیں کامل

دسترس تھا۔ اردو کے ایک تاریخ ساز نثر نگار کی حیثیت سے بھی انکار نہیں۔ دنیا کے چند اہم ترین شاعروں میں ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یعنی غالب کی عظمت کا اعتراف پوری دنیا کرتی ہے یہ سب کچھ! مگر؟ انقلاب ۱۸۵۷ء میں ان کا جو کردار ہے وہ کچھ اچھا نہیں یہاں غالب کی شبیہ بدل جاتی ہے۔ آگے پورے احوال سے واقف ہونے کے لئے میرے اس مقالہ کا مطالعہ کریں۔ یقین مانیئے اس مقالے پر خوب سوالات ہوئے۔ سوال کرنے والوں میں کینڈا کے ڈاکٹر تقی عابدی اور دہلی کے پروفیسر قمر رئیس مرحوم بھی تھے۔

سال ۲۰۰۷ء ہندوستان بھر میں انقلاب ۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ تقاریب والا سال تھا۔ اردو یونیورسٹی میں ''جدو جہد آزادی ہند'' کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد کیا گیا۔ میں نے بھی ایک پرچہ پڑھا جس کا عنوان تھا ''تحریک ریشمی رومال اور اردو''

یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے بہت پہلے شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے ملک کی آزادی کیلئے ایک عالمی تحریک شروع کی تھی۔ افغانستان، روس، جرمن اور ترکی وغیرہ سے روابط پیدا کئے قاصد بھیجے۔ تحریک اتنا آگے بڑھ چکی تھی کہ حکومت کا نقشہ بھی تیار ہو چکا تھا۔ ''راجہ مہندر پرتاب'' کو ملک کا صدر نامزد کیا گیا۔ انگریزوں نے اس تحریک کو ''ریشمی رومال'' نام دیا۔ اس نام کے پیچھے بھی ایک واقعہ ہے۔ بہر حال یہ اتنی منظم اور خفیہ تھی کہ برطانوی حکومت خود دھوکہ کھا گئی اور تحریک کا بانی مولانا عبید اللہ سندھی کو قرار دیدیا۔ انڈیا آفس لندن میں موجود محکمہ خفیہ کے تمام دستاویزات کو ریلیز کر دیا گیا ہے جو اردو میں ترجمہ ہو کر شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس تحریک کے خط و کتابت، رابطے و دیگر امور کی زبان اردو ہے۔ یہ تفصیل آپ کو مقالے میں ملے گی۔ سمینار کے اختتام پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

مئی ۲۰۰۷ء کی کوئی تاریخ تھی کہ پروفیسر صاحب علی صدر شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی نے مجھے ''خیال موسم'' نام سے ایک شعری مجموعہ بھیجا کہ اس پر کچھ لکھنا ہے۔ ''خیال موسم'' جاوید ندیم صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو صنعتی شہر ممبئی میں رہتے ہیں۔ شعر و ادب سے خاص شغف ہے۔

دراصل ہر ادیب وشاعر کی ایک فکر ہوتی ہے۔ ذہنی وابستگی ہوتی ہے وہ کسی خاص مقصد یا اجتماعی مسائل کے اظہار کا وسیلہ بنتا ہے۔ انفرادی یا باطنی احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔ چنانچہ جاوید ندیم صاحب کے کلام میں مجھے جو چیز نظر آئی وہ ہے اعتدال پسندی کا فکری رویہ، افراط وتفریط سے بچ کر ذہنی تحفظات سے پرے ادیب وشاعر کو وہ اعتدال، ارتکاز اور استقلال کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ۷؍جون ۲۰۰۷ء کو میں نے ممبئی یونیورسٹی میں ''جاوید ندیم'' خیال موسم اور فکری رویہ'' عنوان سے پرچہ پڑھا تھا جس میں جاوید ندیم کے کلام اور فکر پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

سرسید کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ادب، تعلیم، مذہب، سیاست، معاشرت اور تاریخ وغیرہ غرض کہ ہر میدان میں اپنی تحریروں، تقریروں اور مخلصانہ علمی کوششوں سے وہ اثرات مرتب کئے کہ کبھی زائل نہیں ہو سکتے۔ چشمہ فیض جاری ہے تو جاری ہے۔ ان کے ہر ہر پہلو پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ سرسید کی ایک لازوال کتاب ''آثار الصنادید'' ہے۔ یہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی تالیف میں سرسید کو انتھک محنت کرنی پڑی اپنی پوری طاقت وصلاحیت کو صرف کیا۔ یہ سرسید کے تاریخی شعور اور تحقیق وجستجو کا پتہ دیتی ہے۔ اگر یہ کتاب منظر عام پر نہ آتی تو شاید ہم دہلی کی عظمت رفتہ سے پوری طرح واقف نہ ہو سکتے۔ اس لئے کہ اب وہ قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ اور تاریخ میں بھی ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی۔ عالمی سہارا نے میرا ایک مختصر مضمون بعنوان ''سرسید کا تاریخی شعور آثار الصنادید کے حوالے سے'' شائع کیا تھا۔ یہاں پر میں نے سرسید کی تاریخ سے دلچسپی اور اس سے متعلق ان کے نظریات کو جاننے کی کوشش کی ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کو ہم سب جانتے ہیں اور اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ملک گیر پیمانے پر یہ انقلاب اچانک برپا نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے کم از نصف صدی کی محنت ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا ۱۸۰۳ء میں دیا جانے والا فتویٰ پھر ان کے تربیت یافتہ سید احمد شہید وشاہ اسماعیل شہید کے مجاہدانہ کارنامے اس کے بعد علماء صادق پور (پٹنہ) کی بے مثال قربانیاں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے شعبہ اردو نے جدو جہد آزادی پر ایک سمینار منعقد کیا تھا اس موقعہ پر میں نے علما صادق پور پر ایک پرچہ پڑھا تھا۔

پروفیسر عبدالستار دلوی سابق صدر شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی سے اردو والے واقف ہیں اس وقت اردو محققین کے صف اول میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ سہ ماہی اردو رسالہ ''نوائے ادب'' ممبئی ان کی ادارت میں نکلتا ہے۔ جو صرف تحقیقی مضامین کے لئے جانا جاتا ہے۔ ۲۰۰۹ء کے ایک شمارے میں انہوں نے میرا مقالہ شائع کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''برطانوی ہند کی سیاست میں شبلی کا موقف''۔

قدیم دہلی کالج کی علمی و ادبی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے حضرات منشی ذکاءاللہ کو اچھی طرح جانتے ہیں ریاضی اور تاریخ ان کے دلچسپ موضوع ہیں زیادہ تر انھیں موضوعات پر لکھا مگر ادب، سائنس اور سیاست پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اتنا زیادہ لکھنے والا دہلی کالج میں شاید ہی کوئی رہا ہو۔ ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں لکھیں جو کم و بیش باون '۵۲' ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی کے مشہور مستشرق '' گارساں دتاسی'' نے اپنے مقالات میں منشی ذکاءاللہ کا ذکر جا بجا کیا ہے۔ مگر کئی جگہ اس نے ذکاءاللہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا بلکہ تنگ نظری کا شکار ہوگیا۔ اس پر میں نے ایک مقالہ تیار کیا تھا جو ذاکر حسین کالج دہلی کے ایک سمینار میں ۲۲ مارچ ۲۰۱۱ء کو پڑھا گیا۔

تبصرہ نگاری ایک اہم کام ہے مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر کس و ناکس تبصرہ کرنے بیٹھ جاتا ہے اور مبتدی کے ہاتھ میں تبصرہ کرنے کے کئے کتابیں تھمادی جاتی ہیں۔ موضوع کا ماہر ہونا، صاحب تصنیف کے فکر و فن اور اس کے کام سے واقف ہونا بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ بہر حال میرے ذہن میں تبصرہ نگاری سے متعلق کچھ باتیں تھیں جسے میں نے ''تبصرہ نگاری: چند معروضات'' عنوان دے کر لکھ ڈالا۔ ماہانہ رسالہ اردو دنیا، نئی دہلی نے جون کے شمارے میں اسے شائع کردیا۔

حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی نے ستمبر ۲۰۱۱ء میں ایک سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا، جس کا موضوع تھا۔

Islam and English in India: Cultural, Literary, Pedagogic Historical, Political and Philosophical Encounters.

صدر شعبہ انگریزی پروفیسر سید مجیب الدین نے ہندوستان کے تین اہم تعلیمی اداروں (دار

العلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) پر ایک مقالہ تیار کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی اور بار بار اصرار کرتے رہے۔ میں ہمت نہیں کر پار ہا تھا کہ صرف ایک مقالہ میں ان تینوں کے ساتھ انصاف کر پاؤں گا یا نہیں۔ کوئی اہم پہلو رہ نہ جائے اور مجھے جو کہنا ہے وہ پوری بات بھی آجائے۔ بہر حال اللہ کا نام لے کر قلم اٹھالیا اور لکھتا چلا گیا۔ امریکہ، یورپ اور ایشیاء کے شرکاء ومندوبین کے درمیان میں نے جب اردو میں اپنا مقالہ پڑھا تو قلب میں ایک انبساط پیدا ہوا اس کی دو وجہ تھی ایک تو شعبہ انگریزی نے اردو کے مجھ جیسے گمنام شخص کو اپنی کانفرنس میں مدعو کیا دوسرے اپنی مادری زبان میں غیر ملکیوں کو بھی کچھ سنانے کا موقعہ ملا گو کہ اس کا ترجمہ ہوا۔ دوسری زبانوں سے مرعوبیت اور اپنی زبان کی کم مائیگی کا احساس جاتا رہا۔ بہر حال آپ میرے اس مقالہ کا ضرور مطالعہ کریں۔

یہ بات بھی عرض کردوں کہ یہ صرف وہی مقالات ومضامین ہیں جو رسائل و جرائد میں شائع ہوئے یا کسی سیمینار میں پڑھے گئے۔ مجموعی طور پر کسی مقالے یا مضمون میں کچھ غلطی نظر آئے تو ضرور نشاندہی کیجئے تا کہ اسے درست کرلیا جائے۔ ویسے علم وادب میں اختلاف کی پوری گنجائش باقی رہتی ہے۔ کسی امر پر تمام کا اتفاق ہو، ضروری نہیں، یہ ممکن بھی نہیں۔ میں پروفیسر خالد سعید کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آنجناب اردو یونیورسٹی کے سینئر ترین پروفیسر ہیں۔ میں اپنے شعبہ کے تمام اساتذہ، ریسرچ اسکالرس، طلبا وطالبات، نیز یونیورسٹی کے دوست واحباب اپنے بچوں واہلیہ کا ممنون ہوں کہ دامے، درمے اور سخنے ہر موڑ پر ان تمام نے میری مدد کی، جزاکم اللہ خیر۔

ستمبر ۲۰۱۱ء

شمس الہدیٰ دریابادی

مشنریاں، عیسائیت اور ردِ عمل (۱۸۴۰۔۵۵)

(آگرہ کے حوالے سے)

انگریزوں کو دنیا کی سب سے مغرور اور عیار قوم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا جنھوں نے محض ایک تاجر کی حیثیت سے ہندوستان میں قدم رکھا اور رفتہ رفتہ اپنی مکاری اور چالبازیوں سے پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔ یہی نہیں بلکہ مذہبی معاملات میں دخل اندازی اور دست درازی ان کا بہترین شیوہ تھا۔ اسی لیے مجبور ہوکر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ۱۸۰۳ء میں ہی ہندوستان کو دارالحرب قرار دیدیا۔ چناں چہ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ہمارے اکابر اور اسلاف جو انسان دوستی اور امن وآشتی کا نمونہ تھے، انگریزوں کو انتہائی نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ہندوستان میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے بعد انگریزوں کی سب سے اہم پالیسی یہ رہی کہ کس طرح پورے ملک کو عیسائیت میں داخل کرلیا جائے تاکہ ہمیشہ کے لئے قومی برتری اور تہذیبی تفوق کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو غلام بنا لیا جائے چنانچہ اسی غرض سے انیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہی ہندوستان میں عیسائی مبلغین کا سیلاب سا اُمنڈ آیا جو صدی کے نصف تک نقطہ عروج کو پہنچ چکا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ اسلام اور مسلمان قوم تھی جس سے انھوں نے اقتدار حاصل کیا تھا، عیسائی مشنریوں نے یہاں پہنچتے ہی مناظروں کی شکل میں مسلمانوں کو چیلنج کیا۔ چوں کہ آگرہ اس وقت علم کا ایک اہم مرکز تھا اس لئے ۱۸۴۰ء کی دہائی میں

آگرہ اسلام اور عیسائیت کے مابین بحث و مباحثہ کا خاص مرکز رہا۔

برطانوی حکومت نے عیسائی مشنریوں کی حمایت کرنے اور ان کے موافق سازگار ماحول بنانے کی پالیسی اپنائی۔ ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ نے مشنریوں کی آمد کا دروازہ کھول دیا' ان برطانوی افسروں کو جو مشنریوں کی نقل و حرکت میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے تھے' شمال مغربی ریاستوں میں ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۰ء کی دہائیوں کے درمیان تعینات کیا گیا' ان میں خاص طور سے جیمس تھامسن (James Thamson) قابل ذکر ہے جو شمال مغربی ریاستوں کا ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۳ء کے درمیان لفٹنٹ گورنر تھا، ۱۸۴۰ء کی دہائی کے درمیانی سالوں سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ولیم میور جو کہ گورنمنٹ کا سکریڑی تھا' ذاتی حمایت اور فاضلانہ دلچسپی اسلام میں دکھائی۔ مشنریوں کے ملازمین میں یہاں تک کہ فوجی افسروں میں بھی عیسائیت کا جوش ابھر رہا تھا۔ مثلاً کرنل وہیلر (Colonel Wheler) جو اس وقت آگرہ میں تعینات تھا' اپنی فوجوں میں عیسائی جذبہ ابھارنے کے لئے ایک بہترین مقرر کی حیثیت سے بدنام تھا۔ (۱)

مشنریوں نے جلد ہی مذہبی اشاعت کی غرض سے پریس کو قائم کیا جہاں انجیل' مذہبی رسائل اور مبلغین کے مقالات کی کاپیاں فارسی' اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں شائع ہوتیں اور تقسیم کی جاتی تھیں۔ پریس کے قیام سے اتنا ضرور ہوا کہ انگریزوں اور ہندوؤں و مسلمانوں کے مابین ترسیل اور ابلاغ کا اہم رابطہ قائم ہوا۔ یہ پریس "چرچ مشنری سوسائٹی" (Church Missionary Society) کے تحت چلتا تھا۔ یہاں پر غریب اور بے گھر بچوں کو کام کرنے کی مشق دی جاتی تھی' جن میں سے اکثریت عیسائیت کو قبول کر لیتی۔

۱۸۴۱ء کو پادری کارل گوٹب فنڈر (kari Gottieb phander) آگرہ میں وارد ہوا اور چرچ مشنری سوسائٹی (CMS) میں کام کرنے لگا اور بلا تاخیر اس نے علماء کو اسلام اور عیسائیت پر مناظرہ کی دعوت دی۔ اس نے علما کو فارسی ایڈیشن کی اپنی تین کتابیں بھی بھیجیں جو کہ اس نے مشرق وسطیٰ میں اپنی پندرہ سالہ تبلیغی کام کے دوران مسلمانوں میں تقسیم کی غرض سے لکھی تھی۔ (۲) فنڈر کی پہلی کتاب "میزان الحق" فارسی میں کلکتہ سے ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی جب کہ اردو میں

مرزا پور سے ۱۸۴۳ء اور لندن سے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کی دوسری تصنیف ''مفتاح الاسرار'' فارسی اور اردو میں آگرہ سے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کی تیسری کتاب ''طریق الحیات'' فارسی میں لاہور سے ۱۸۳۷ء میں اور اردو میں آگرہ سے ۱۸۵۳ء میں منظر عام پر آئی۔ یورپی لوگوں میں تقسیم کی غرض سے اس کی انگریزی میں ایک کتاب Remarks on the Nature of Muhammad anism Tradition نام سے ۱۸۴۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ (۳)

فنڈر کو اپنے ہم عصر کسی بھی برطانوی اور امریکی مشنریوں کے مقابلے میں اسلامی علوم پر زیادہ عبور حاصل تھا' اور ساتھ ہی فارسی' عربی اور اردو زبانوں پر قدرت ہونے کی بنا پر اس نے علماء کو چیلنج کیا۔ ایک نئے اور ناگوار لہجہ کی بہ نسبت کسی حد تک مسلمانوں کے عقائد اور رسم و رواج کے داخلی معلومات سے ہی اس (فنڈر) کو سروکار تھا۔ حالاں کہ دوسرے تمام عیسائی مبلغین اعلانیہ طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر سخت الفاظ و القاب میں ملامت کرتے تھے۔ فنڈر نے عیسائیت کی رہبانیت اور انجیل مقدس کی تعلیمات پر ہی اپنے خیالات اور توجہ کو خصوصی طور پر مرکوز کیا۔ علماء نے خطرے کی گھنٹی کو محسوس کر لیا کہ عوام اور خواص دونوں طبقہ کے مسلمانوں کے عقائد بگاڑ کر گمراہی کی طرف رفتہ رفتہ لے جانے کا سبب بن سکتا ہے۔

فنڈر اور علماء کے درمیان مناظرے کے عوامل اور محرکات پہلے سے موجود تھے۔ دراصل مشنریوں اور مسلمانوں کے مابین تعلقات کشیدہ تھے ہی کہ ۱۸۳۳ء میں Joseph Wolff نام کا ایک جرمن یہودی جو بعد میں کیتھولک عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا' پورے شمالی ہندوستان میں ایک مبلغ کی حیثیت سے سفر کرتا رہا۔ اس کی تقریروں کا لب لباب یہ تھا کہ ۱۸۴۷ء میں دنیا کے خاتمہ کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔ اس کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ چنانچہ خاندانی اثر و رسوخ کی بنا پر اس کی رسائی ایسٹ انڈیا کمپنی کی اعلیٰ عہدے داروں تک تھی۔ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ Majar John Low اور دہلی میں گورنر جنرل کے ایجنٹ Voilliam Fraser کے ذریعہ اس دور کے شمالی ہندوستان کے نامور علماء سے ملاقات کی حالاں کی دہلی میں اس کے مباحثوں نے مسلم حلقوں میں کوئی نقوش ثبت نہیں کیے' لیکن لکھنؤ کے شیعہ مجتہد مولانا سید محمد سے اس کی ملاقات نے

شیعہ مدرسہ کے فضلا کو عیسائیت میں دلچسپی پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس میں مضبوطی اس وقت آئی جب بنارس کے قریب ''چنار'' کی ایک C.M.S مشنری نے مجتہد کو یہ لکھ کر کھلبلی مچائی کہ ایک دیسی اخبار میں اس نے لکھنؤ مناظرہ کے بارے میں پڑھا ہے۔ گویا اس نے اپنی طرف سے مباحثہ کی دعوت دی۔ چناں چہ چھ مہینہ تک مجتہد سے مراسلت ہوتی رہی جو کہ ۱۸۳۳ء میں اختتام کو پہنچی۔ ۱۸۴۳ء میں آگرہ کے مناظروں کے عروج اور ۱۸۳۳ء میں لکھنؤ مناظرہ کے آغاز کے درمیانی دس سالوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے دو اہم ردعمل دکھائی دیتے ہیں۔

اول یہ کہ بنگال کے مشنری جریدے نے مجتہد سے ہوئی مراسلت کو عین اس موقعہ پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا جب فنڈر مشرق وسطیٰ سے کلکتہ پہنچا ہی تھا۔ ۱۸۳۹ء میں اس نے عیسائیت کے خلاف گمراہ کن اثرات کا ماحول دیکھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان جوش وخروش پھیل چکا ہے چناں چہ اسلام پر اپنی کتابوں کے اردو ایڈیشن کی تیاری میں اس کو دوگنی محنت کرنی پڑی۔

دوم یہ کہ فوری اثرات شیعہ مدرسہ کے فضلا تک محدود تھے لیکن یہ طبقہ مجتہد کی قیادت میں عیسائت کے سلسلے میں مواد فراہم کرنے اور اسلام کے دفاع کی تیاری میں اپنی توجہ صرف کی۔ (۴)

۱۸۴۱ء میں فنڈر آگرہ پہنچا (۵) اور اس فکر میں تھا کہ نامور علما کی توجہ کو حاصل کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے پریشانی یہ تھی کہ اکثر علما کا منشا یہ تھا کہ عیسائیت کو نظر انداز اور کسی حد تک اس کی تردید کی جائے۔ اس کے باوجود فنڈر نے علما سے رابطہ قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ چناں چہ اس نے سب سے پہلے خط وکتابت کا سلسلہ لکھنؤ کے انھیں شیعہ مجتہد سے شروع کیا جن کی عیسائیت میں دلچسپی تھی۔ ۱۸۴۲ء کے دوران دونوں کے مابین خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ مجتہد نے فنڈر کو مناظرے سے متعلق پانچ رسالے ارسال کیے، جس میں عیسائیت کی تردید کی گئی تھی۔ (۶)

مجتہد نے اس بات پر زور دیا کہ اشکالات کا مناسب انداز میں جواب دینا چاہیے۔ ان کے نزدیک ''توحید اور تثلیث'' ہی عیسائیت اور اسلام کے درمیان تنازعہ کی بڑی وجہ ہے۔ انھوں نے فنڈر کے اس دعوی کو غلط بتایا کہ تثلیث کی حقیقت پر اسرار ہے اور دلائل کے بجائے وحی کے ذریعہ اس کو ثابت ہونا چاہئے۔ ان کے خیال میں استدلال ہی مذہبی سچائی کی بنیاد ہے نہ کی وحی یا الہام یہ

پہلا موقعہ تھا جب عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان مباحثوں میں استدلال پر زور دیا جانے لگا۔

دوسرے اہم مسلمان جن کو فنڈر نے اپنے قریب کیا وہ فتح پور سیکری میں واقع شیخ سلیم چشتی کی درگاہ کے سجادہ نشین ''کاظم علی'' تھے جن کے بارے میں فنڈر کا یہ گمان تھا کہ اس علاقے کے وہ پہلے صاحب علم مسلمان تھے۔ (۷) انھوں نے فنڈر کے ذریعہ دی گئی کتابوں کو قبول کیا اور ابتداً عوامی مباحثوں میں دلچسپی کا اظہار کیا، لیکن جلد ہی انھوں نے مذہب سے متعلق مزید کسی بھی مباحثے میں شرکت سے انکار کر دیا۔ جب کہ مناظرہ کا نتیجہ فنڈر کے حق میں منفی ہی رہا۔

تیسرے اہم شخص جن سے فنڈر کے تعلقات تھے وہ آگرہ گورنمنٹ کالج کے شعبہ عربی کے صدر پروفیسر ''نورالحسن'' تھے جن کا رابطہ علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ دونوں کے ساتھ رہا۔ انھوں نے فنڈر کے خلاف کچھ لکھنا چاہا لیکن اس نے پروپیگنڈہ کر کے دو افواہیں پھیلا دیں۔ اول یہ کہ مذہبی مباحثوں میں حصہ لینے سے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر نورالحسن کی ملازمت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس ڈر میں کچھ حقیقت ضرور تھی لیکن دوسرے پہلو سے دراصل فنڈر کے آگرہ پہنچنے سے قبل ہی شعبہ عربی کو ختم کرنے پر غور وخوص ہو رہا تھا۔ (۸)

دوم یہ کہ فنڈر کے منشی نے یہ اطلاع اس کو دی کہ پروفیسر نوارالحسن نے علما کی مجلس میں اعتراف کیا کہ وہ ابطال مذہب پر لکھنے کی قدرت نہیں رکھتے، کیوں کہ انھیں انجیل کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ شاید اس وقت کا یہ سب سے اہم مسئلہ تھا کہ جب علما کی اکثریت اس رائے پر متفق تھی کہ انجیل، جو بڑی تعداد میں تقسیم کی جاتی تھی، کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ جب کہ دہلی اور آگرہ کے مدرسوں اور کالجوں میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ عیسائیت کے سلسلہ میں تحقیق سے کام لیا جائے جس کی ابتدا لکھنؤ کے شیعہ مدرسوں نے کر دی تھی۔

فنڈر علما کے طبقہ سے تعلقات استوار کرنے میں ناکام رہا۔ ستمبر ۱۸۴۲ء میں فنڈر کو صدر دیوانی عدالت کے دو وکلاء نے خطوط لکھے جن کے نام ''محمد کاظم علی'' اور ''سید رحمت علی'' تھے۔ یہ مراسلت جون ۱۸۴۴ء تک چلتی رہی، جس میں فنڈر کو اس بات کی جانب توجہ دلائی تھی کہ عیسائیت اور اسلام کے مناظروں اور بحثوں کا موضوع آگرہ کی مسجد اور مدرسوں سے نکل کر عدالت میں بھی پہنچ چکا ہے۔

انھیں برسوں میں ایک اہم شخصیت جو مناظروں کے اسٹیج پر دکھائی دیتی ہے وہ ہیں ایک شیعہ عالم ''آل حسن'' جو صدر دیوانی عدالت آگرہ میں ملازم تھے۔ آل حسن کا تعلق لکھنؤ کے قریب قصبہ موہن سے تھا۔ ان کے والد نواب سعادت علی خاں کے یہاں ملازم تھا۔ اس خاندان کا تعلق علمائے فرنگی محل سے بھی رہا ہے۔ آل حسن الہ آباد کے صدر دیوانی عدالت میں محرر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ عدالت کے آگرہ منتقل ہونے پر ان کا قیام بھی آگرہ میں ہوگیا۔ اس وقت آگرہ شہر مناظروں کا میدان بنا ہوا تھا۔ چناں چہ انھوں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ان کا خاص موضوع ''تحریف انجیل'' رہا جب کہ مباحثوں میں عقلی اور منطقی دلائل پر زور دیا جس کی بنیاد پہلے ہی لکھنؤ میں پڑ چکی تھی۔ آل حسن نے فنڈر سے طویل خط و کتابت کا سلسلہ رکھا جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مشنری کے ایک رسالہ میں شائع ہوا۔ (۹) اسے بعد میں عیسائیت کی تردید میں ایک کتابی شکل دیدی گئی۔ (۱۰)

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ آل حسن نے تحریف پر کام کیا' انھوں نے اردو' ہندی' فارسی اور عربی میں لکھی گئی انجیل کا براہ راست مطالعہ کر کے اس پر اپنی رائے قائم کی۔ دراصل وہ ہندوستانی مسلمانوں میں پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنے موضوع کی بنیاد اس پر رکھی کہ آیا عیسائی علماء انجیل کے سلسلے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ آگرہ میں ان کی تقرری اور فنڈر سے ہوئی مراسلت کی اشاعت نیز مشنریوں سے گہرے روابط کی بنا پر مباحثوں کے میدان کی یہ ایک مشہور شخصیت تھی۔ ۱۸۴۶ء میں آل حسن کا فتح پور ضلع الہ آباد میں مصنف کے عہدے پر تقرر ہو جانے اور اس کے بعد حیدر آباد میں نظام کی ملازمت اختیار کرنے سے مناظروں میں ان کی دلچسپی تقریباً ختم ہوگئی۔ (۱۱)

آل حسن کے آگرہ سے چلے جانے کے بعد تقریباً پانچ برسوں تک خاموشی چھائی رہی اس دوران فنڈر اسلام کے خلاف کتابیں لکھنے اور تبلیغ کے کام میں لگا رہا۔ بالآخر ۱۸۵۲ء میں مناظروں کا دور دوبارہ شروع ہوا اور اس بار بجائے آگرہ کے دہلی اس کا مرکز رہا۔

دہلی میں عیسائی مبلغین کی آمد سلسلہ کا اس وقت شروع ہوتا ہے جب برطانیہ کی Baptist Missionary Society نے ۱۸۱۸ء میں پادری J.T. Thompson کو بھیجا اور اپنی

آخر عمر یعنی ۱۸۵۰ء تک وہ یہاں عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا۔ یہ زیادہ تر ہندوؤں میں ان کے مذہبی مقامات پر جا کر تبلیغ کرتا تھا۔ تھامسن ایک سلجھا ہوا اور ہجوم میں بے تکان بولنے والا مقرر تھا۔ تاہم اس کے وقت میں کسی مباحثہ کا عمل شروع نہیں ہوتا۔ (۱۲)

اس کے بعد ۱۸۵۰ء کی دہائی میں پادری M.J. Jennings نے تبلیغی کام کو سنبھالا یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا Chaplain تھا۔ (۱۳) مغل سلطنت کے زوال کے بعد دہلی کے علما میں بیداری پیدا ہوئی جس میں شاہ ولی اللہؒ کا خاندان پیش پیش تھا۔ جنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی گرتی ہوئی تہذیب وثقافت کو سنبھالنے کی غرض سے دہلی میں مدارس اور خانقاہوں کا جال پھیلا دیا۔ (۱۴)

آگرہ کے بعد دہلی میں بھی عیسائی مشنریوں کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا۔ چناں چہ دہلی کی سربر آوردہ شخصیات بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ ایسی ہی ایک اہم شخصیات ماسٹر ''رام چندر'' کی تھی۔ یہ قدیم دہلی کالج میں سائنس اور ریاضی کے استاذ تھے۔ رام چندر انتہائی ذہین وفطین اور ذی علم شخص تھے۔ آخر میں رام چندر نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا اور اسلام کے اوپر اپنے مضامین کے ذریعہ اعتراضات کرتے رہے ان میں سب سے اہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سے انکار اور اس کے رد پر لکھتے رہے۔ چناں چہ رام چندر نے دہلی کے قاضی کو اس سلسلے میں ایک خط لکھا جس کا تفصیلی جواب انھوں نے دیا۔ (۵) ایسی ہی ایک اہم شخصیت دہلی کے سرجن ڈاکٹر چمن لال کی تھی جنھوں نے عیسائیت کو قبول کرلیا۔ (۱۶) ان دونوں کے عیسائی ہو جانے سے دہلی کالج میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔

ماسٹر رام چندر کے ذریعہ معجزات کے سلسلے میں اٹھائے گئے شبہات کو آگرہ کی C.M.S مشنری نے اردو میں شائع کر کے دہلی کے عوام میں تقسیم کرایا۔ بعدازاں اسی میں ''سوال نامہ کراچی'' نام سے تیس سوالات کا اضافہ کر کے دہلی کے علما کے پاس مشنری نے بھیجا جس نے مسلمانوں میں زبردست ہیجان پیدا کر دیا۔ اس میں کراچی کے کسی جدید تعلیم یافتہ مسلمان کی جانب ان سوالات کو منسوب کر کے یہ کہا گیا تھا کہ انھیں اسلام کی حقانیت پر شبہ ہے۔ چناں چہ علما ان سوالات کا جواب

دے کر اسلام کو سچا ثابت کریں۔ (۱۷)

مفتی ''صدر الدین'' آزردہ جو دہلی کے صدر مفتی تھے اور دہلی کالج کے شعبہ عربی میں ممتحن کی حیثیت سے جاتے تھے' انھوں نے کالج کے طلبہ کو مشنری کی جانب سے تقسیم کیے گئے کتابچوں کو پڑھنے سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ بالآخر علمائے دہلی نے مشنریوں کی کارروائیوں اور اسلام پر حملوں کا جواب دینے پر غور کیا۔ ان میں سب سے اہم شخصیت ''مولانا رحمت اللہ کیرانوی'' کی ہے۔ (۱۸)

انھوں نے جلد ہی اس کے جواب میں دو کتابیں شائع کیں اور مزید ان تمام سوالات اور اشکالات کے جواب تحریر کرنے میں مصروف ہو گئے جسے فنڈر نے اٹھایا تھا۔ (۱۹) اس کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانوی آگرہ فنڈر کے دروازے پر پہنچ گئے اور اس کو برسرِعام مناظرہ کا چیلنج دیا۔

۱۰/ اپریل ۱۸۵۴ء کے روز کٹرہ عبدالمسیح آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔ مولانا کیرانوی کے ساتھ ان کے معاون ڈاکٹر محمد وزیر خاں (۲۰) اور مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ (۲۱) ڈاکٹر صاحب چوں کہ انگریزی زبان سے واقف تھے لہٰذا عیسائیوں کی تازہ اور نئی مطبوعات انجیل کی تفاسیر وغیرہ مولانا کو فراہم کرتے اور ان کے علمی و مباحثی کاموں میں برابر مدد کرتے رہے۔ عیسائیوں کی جانب سے مناظر اول پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ تھے۔ اس موقعہ پر حکام شہر' عمائدین و رؤساء' علماء' غیر مسلم اور مسلم عوام بڑی تعداد میں موجود تھے۔

لگاتار دو دن کے علمی مباحثہ کے بعد فنڈر نے راہ فرار اختیار کی اسے انجیل میں تحریف کا اقرار بھی کرنا پڑا۔ یہی سال مناظروں اور مباحثوں کے عروج اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی ایک بڑی کامیابی کے بعد اس کے اختتام کا بھی تھا۔

اس مناظرہ کی پوری کیفیت ''البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف'' کے نام سے وزیر الدین نے مرتب کر کے ۱۲۷۰ھ میں فخر المطابع شاہ جہاں آباد (دہلی) میں چھپوا کر تقسیم کرادی۔

اسی مناظرہ کو "مباحثہ مذہبی" حصہ اول کے نام سے سید عبداللہ اکبرآبادی نے آگرہ سے چھپوایا جو کہ فارسی میں ہے دوسرا حصہ "مراسلاتِ مذہبی" کے نام سے اردو میں ہے جو کہ پادری فنڈر اور ڈاکٹر وزیر خاں کے درمیان تحریری مناظرہ ہے۔ (۲۲) اس کتاب کا عربی ترجمہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب "اظہار الحق" کے حاشیہ پر مطبوعہ ہے، جو کہ مصر سے شائع ہوا۔

حواشی

(1) J. Richter, A History of missions in india 1908, P. 151

(2) Pfarider Missionary journals in the Basel Missionary Society Archives and the Church Missionary Society Archives.

(3) Indian Society and the Beginnings of Modernisation (1830-50) Calited by C.H phillips and Mary Doreen wainwright School of Oriental and African Studies University of London (1976) P.

(4) Joseph wolff Researches and Missionary Lobours (London, 1835)

(۵) مولانا سید محمد میاں صاحب نے علماء ہند کا شاندار ماضی (جلد چہارم) کے صفحہ ۳۱۲ پر تحریر فرمایا ہے کہ فنڈر ۱۸۵۴ء میں ہندوستان پہنچا اور مارچ ۱۸۵۶ء میں مناظرہ ہوا پھر آگے صفحہ ۳۵۹ پر کہتے ہیں کہ اپریل ۱۸۵۴ء کو مناظرہ ہوا۔ دراصل مولانا سے تاریخی تسامح ہو گیا۔ مناظرہ تو اپریل ۱۸۵۴ء میں ہی ہوا جب کہ فنڈر تیرہ سال قبل یعنی ۱۸۴۱ء میں ہی پہنچ چکا تھا۔ اگر مولانا سید محمد میاں کی بات مان لی جائے تو فنڈر کی جو تبلیغ سرگرمیاں ہیں جیسا کہ آئندہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آرہا ہے وہ چند مہینوں کی نہیں ہو سکتی بلکہ برسوں کی کارگردگی ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ K.G. Pfander ,Journalist,1843

(۶) فنڈر اور مجتہد کے درمیان ہوئی مراسلت کو ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ سے "کشف الاسطار" نام سے مجتہد کے بھتیجے مولانا محمد ہادی نے شائع کیا تھا۔

(7) K.G Pfander,Journal, 9 jan 1843 .

(8) J.Kerr A Review of public Instruction in the Bengal Presidancy from 1835 to 1851 Part 11

(۹) خیر خواہ ہند مرزا پور، 1844-45

(۱۰) کتاب استفسار، آل حسن، لکھنؤ 1846ء

(11) Agra Governament Gazette vol. 111 no 7.17 feb 1846 P.P 82.86

(12) E.S Wenger , Missionary biographies vol iv Carey Library , Serampors P.P 41-42

(۱۳) اسکول جیل خانہ یا نجی مکانات میں کوئی چھوٹی عمارت یا کمرہ جیسے عیسائی لوگ عبادت گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اسے chapel اور اس پادری کو Chaplain کہتے ہیں۔

(۱۴) تاریخی مقالات، خلیق احمد نظامی دہلی ۱۹۶۶ء ص:۱۹۶۶ء ص:۲۵۷۔۲۱۰

(15) Edwin Jacob A Memoire of professor Yesudas Ram Chandra of Delhi .Delhi S.G.P Mission 1902

صدیق الرحمن قدوائی، ماسٹر رام چندر شعبہ دہلی یونیورسٹی دہلی، ادبی پرنٹنگ پریس ممبئی۔ 1961ء ص 39

(۱۶) مولوی عبدالحق مرحوم دہلی کالج انجمن ترقی اردو ہند۔ 1989ء ص 85

(17) Indian Society and the begning of Moder nisation Edited by C.H Phillips University of london 1976 p.p 150-51

(۱۸) مولانا رحمت اللہ عثمانی کا تعلق ضلع مظفر نگر کے ایک مردم خیز قصبہ کیرانہ سے تھا۔ لیکن آپ کے اجداد کا اصلی وطن پانی پت بتایا جاتا ہے۔ آپ انتہائی عالم فاضل اور دانشمند بزرگ تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں انگریزوں نے آپ کی تمام جائداد (جو اس وقت لاکھوں کی رقم میں تھی) قرق کر کے نیلام کردی، مولانا اپنا نام مصلح الدین بدل کر کسی طرح جے پور اور جودھپور کے ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے سورت بندرگاہ پہنچے اور وہاں سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں پر مدرسہ صولتیہ قائم کر کے لافانی کارنامہ انجام دیا۔ سلطنت عثمانیہ ترکی کے سلطان عبدالحمید خاں سے بھی نیاز حاصل رہا۔ پادری فنڈر یہاں سے فرار ہو کر جب قسطنطنیہ پہنچا تو سلطان کی دعوت پر مولانا وہاں پہنچے اور فنڈر کو 1867ء میں شکست فاش دی، 2 مئی 1891ء کو مدینہ منورہ میں آپ کا انتقال ہوا۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ علماء ہند کا شاندر ماضی، جلد چہارم، سید محمد میاں، کتابستان قاسم جان اسٹریٹ دہلی۔ ص ۳۰۷ تا ۳۱۳

(۱۹) محمد سلیم: ایک مجاہد معمار، 1952ء کلکتہ اور امداد صابری: آثار رحمت 1967ء دہلی۔

(۲۰) ڈاکٹر محمد وزیر خاں کا اصل وطن بہار بتایا جاتا ہے۔ کلکتہ میڈیکل کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یورپ کا سفر بھی کیا تھا جہاں یونانی اور عبرانی زبانوں کو سیکھا۔ آگرہ کے تھامسن ہاسپٹل میڈیکل اسکول میں سرجن تھے۔ تاج محل کے قریب محلّہ کا غذیاں میں سکونت تھی۔ یہیں مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے آپ کا تعارف ہوا اور علمی رجحانات کی یگانگت نے ایک جان دو قالب بنادیا۔ 1857 کی ناکامی کے بعد آپ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔

(۲۱) مولانا فیض احمد بدایونی جن کی پیدائش 1808ء میں ہوئی، علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ ایک بزرگ شخصیت تھی۔ بدایوں میں ایک عرصہ تک درس و تدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد انگریزی حکومت میں ملازمت اختیار کرلی۔ مناظرۂ آگرہ میں آپ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی بڑی مدد کی۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لکھنؤ میں مولانا شاہ احمد اللہ صاحب کے ساتھ معرکہ میں رہے۔ لیکن ہر طرح کی ناکامی اور شاہ احمد اللہ کی شہادت کے بعد ایسے روپوش ہوئے کہ آپ کے ماموں مولانا فضل رسول نے آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ تک سفر کیا مگر کہیں سراغ نہ لگ سکا۔

(22) Indian Society and the Beginings of Modernisation : Edited by C.H Phillips University of London 1976 p . 153

(ماہنامہ رسالہ ''دارالعلوم'' دیوبند، جون، ۲۰۰۰ء)

☆☆☆
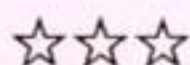
علمائے روہیل کھنڈ اور اُردو نثر ۔ ۱۸۵۷ء سے قبل

علماء کی جماعت اُردو زبان اور اُردو پڑھنے لکھنے والوں کی بڑی محسن ہے۔ یہی وہ جماعت ہے جس نے پہلے پہل اس زبان کو بال و پر عطا کیے' تحریر و کتابت کے بلند منصب سے نوازا' اظہار و تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ اس میں مذہبی اور دینی مسائل بیان کیے اور اسے نئے افکار نئے لہجے اور نئے اسلوب سے روشناس کرایا۔

علماء کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت اس زبان میں تصنیف و تالیف کی طرح ڈالی جب کہ اردو کے قواعد اور ضوابط مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اسی زبان میں کتابیں لکھنا اور ترقی یافتہ عربی و فارسی میں مرقوم مسائل کو اس نوزائیدہ زبان میں منتقل کرنا انتہائی مشکل تھا لیکن علمائے دین کی ہمت اور فکری استعداد ملاحظہ ہو کہ وہ اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے اس طرح کوشاں ہوئے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اسے نئے محاورات' نئے اسالیب اور الفاظ کے نئے ذخیرے سے مالا مال کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اردو کا شمار کسی قدر ترقی یافتہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس وقت یہ ایک بڑے طبقے کی زبان ہے یہی نہیں بلکہ ہر طرح کا لٹریچر اس میں منتقل کیا گیا ہے اور روز بروز کیا جا رہا ہے۔

علمائے عظام کی اردو نثر کی بعض تصنیفات میں اختلافی اور نزاعی مسائل بھی بیان ہوئے اور کہیں کہیں ان میں کسی قدر شدت کا عنصر بھی اُبھر آیا ہے لیکن اس میں اردو کی خدمت کا یہ پہلو نمایاں ہے کہ ان اختلافی اور نزاعی مسائل کا جواب بھی اردو ہی میں دیا گیا اور پھر جواب الجواب

کے لیے بھی اسی زبان کو منتخب کیا گیا۔ اس طرح متنازع فیہ مسائل کا بیان بھی بہر حال اردو کی نشو ونما اور ارتقاء کا ذریعہ ثابت ہوا۔

اردو نثر کی تاریخ لکھنے والوں کا بالعموم یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی سرگرمیوں سے اس کا آغاز کرتے ہیں، پھر شاہ عبد القادر، شاہ رفیع الدین یا دو چار مذہبی کتابوں مثلاً تقویۃ الایمان وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے خطوط غالب اور سرسید تحریک پر آجاتے ہیں۔ اردو نثر کے ارتقاء کے بارے میں دیگر علماء کے کارناموں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالانکہ اردو زبان کی تاریخ کا ایسا پہلو ہے جو انتہائی لائق توجہ ہے۔

میں اپنے اس مضمون میں شمالی ہند کے خطہ روہیل کھنڈ کے علماء کی نثری خدمات (۱۸۵۷ء سے قبل) پر روشنی ڈالنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ صرف ایک علاقے کے علمائے کرام کی جب یہ خدمات ہیں تو تمام ہندوستان کے علماء کی کاوشوں کے نتیجے میں جو ذخیرہ جمع ہوا ہے وہ اردو کے نثری ادب کا کتنا قیمتی سرمایہ ہے۔ جس سے چشم پوشی کرنا یقیناً ایک زبردست تاریخی غلطی ہوگی۔

روہیل کھنڈ کا علاقہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ دہلی اور لکھنؤ کے وسط میں واقع ہے اور دونوں مرکزوں کی علمی و ادبی روایات کا امین رہا ہے۔ روہیل کھنڈ میں بدایوں سہسوان آنولہ، امروہہ، سنبھل وغیرہ وہ مقامات ہیں جہاں مسلمانوں کے قدم ان کی ابتدائی فتوحات کے زمانے میں پہنچے اور علماء وصوفیاء نے پوری خود اعتمادی اور عزم واستقلال کے ساتھ تبلیغی، تعلیمی اور تصنیفی اداروں کی تشکیل کی۔ جب اس علاقوں پر روہیلوں کا اقتدار قائم ہوا تو دوسرے مقالات، مثلاً بریلی، پیلی بھیت، اور جھیاٹی، بسولی، شاہجہاں پور، رامپور، مراد آباد اور نجیب آباد وغیرہ علوم اسلامی اور علماء وفضلاء کی تعلیمی سرگرمیوں کے مراکز بن گئے اور وہاں درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کے ہنگامے گرم ہوئے۔

روہیل کھنڈ کے قدیم شہر بدایوں کے متعلق سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

''اسلام کے علم وفضل کا مرکز جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی

منزل بدایوں معلوم ہوتی ہے۔ حضرت سلطان الاولیاء نظام الدینؒ
بدایونی دہلوی وہ سیاح معرفت ہیں جنہوں نے بدایوں اور دہلی کی
منزلوں کو ملا دیا''۔ ۱

اب ہم علماء کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔

مولوی عبدالمجید قادری

مولوی عبدالمجید قادری۲ (۱۷۶۴ء تا ۱۸۴۶ء) جو کہ بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان کے فرد ہیں، بدایوں کے پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ انہوں نے اردو میں تین کتابیں ''نجات المومنین''، ''محافل انوار فی احوال سید الابرار'' اور ''ہدایت الاسلام'' لکھیں۔ نجات المومنین موضوع کے اعتبار سے ایمان وارکان اسلام سے متعلق ہے۔ دوسری کتاب محافل انوار فی احوال سید الابرار جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ پر مشتمل ہے۔ ۱۸۱۵ء میں لکھی گئی۔ ۳ ۔ ان کی تیسری کتاب ہدایت الاسلام، جس کا قلمی نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں موجود ہے، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیف ''تقویۃ الایمان'' کے رد میں لکھی گئی۔

زبان و بیان کے اعتبار سے ان کی تصانیف کی چند خصوصیات ہیں مثلاً:

''۱۔ عربی و فارسی الفاظ کی جمع اردو طریقے سے بنائی گئی ہے جیسے امر کی جمع امروں، پاک کی جمع پاکوں وغیرہ

۲۔ ہندی الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے، مثلاً سوگند، باسن (برتن)۔

۳۔ قدیم طرز کے مطابق مضاف پہلے، مضاف الیہ بعد میں، موصوف پہلے صفت میں بعد میں جیسے شریعت ایمان کا، علم ایمان اور اسلام کا وغیرہ

۴۔ قافیہ پیمائی بھی ہے۔ مثلاً الماس نور سے کارگاہ ظہور میں جواہر ...... پروتا ہے۔ ...... اور کلمہ اور جلوہ جمال تجلی اور جلال اوس کے کا دکھاتا ہے۔'' ۴

مولانا سلامت اللہ کشفی

مولانا سلامت اللہ کشفی [5] (ف ۱۸۶۴) اپنے دور کے زبردست عالم و شیخ طریقت تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس اور اشاعت اسلام میں گزرا۔ خاندان ولی اللہی کے فیض یافتہ تھے ان کی تمام تر تصانیف عربی و فارسی میں ہیں صرف ایک کتاب ''خدا کی رحمت'' اردو زبان میں ملتی ہے۔ جس کا موضوع میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

مولانا کا انداز تحریر قدیم ہے۔ پرانی ترکیبیں، موصوف صفت سے پہلے، مضاف، مضاف الیہ سے قبل اور قدیم طرز پر جمع کا استعمال عام ہے مثلاً:

''قبیلہ بنی سعد کی عورتیں دودھ والیاں دوبار...... مکے میں آئیں۔ [6]

مزید:

''حق تعالیٰ نے برکت اوس لڑکے سے کہ قریش میں پیدا ہوا ہے''۔ [7]

مولانا جلال الدین باقر

مولانا جلال الدین باقر [8] (ف ۱۸۵۲) شاہ عبدالعزیز کے شاگرد اور اپنے دور کے مشہور عالم تھے انہوں نے اپنے بچوں اور عورتوں کے لیے ایک رسالہ ''جواہر المواعظ'' نام سے اردو زبان میں تحریر فرمایا جس میں اصلاح معاشرت سے متعلق مضامین ہیں۔ یہ رسالہ ان کے خاندان میں قلمی صورت میں محفوظ تھا جسے مولوی نظام الدین حسین مالک نظامی پریس بدایوں نے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ اس میں مصنف کے قدیم املا کا التزام رکھا گیا ہے۔

''جواہر المواعظ'' کی زبان سادہ اور عام بول چال کے مطابق استعمال کی گئی ہے۔ مگر مصنف نے کہیں کہیں عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ مصنف نے اس زمانے کے رواج کے مطابق اردو کو ہندی زبان کہا ہے۔ عورت کی جمع اکثر عورات لکھا ہے جب کہ منہ کا املا مونہہ، تیار کا املا طیار، چھوکرا بمعنی ملازم جب کہ مسلمانی بمعنی مسلمان ہونا لکھا ہے۔

مولوی سعد الدین عثمانی

مولوی سعد الدین عثمانی 9 نے اردو زبان میں کئی رسالے تصنیف کیے جن میں ''سعادت دارین''، ''رفاہِ عام''، ''شرح مسائل اربعین'' اور ''تحقیق الحقوق'' وغیرہ مشہور ہیں۔ ان رسالوں میں انہوں نے ولی اللہی افکار و خیالات کی اشاعت کو موضوع بنایا ہے۔ ''سعادت دارین'' میں غیر اسلامی رسوم و عقائد پر ضرب لگائی ہے جو کہ مسلم معاشرے میں مروج تھے۔ زبان نہایت سلیس اور با محاورہ ہے عربی و فارسی کے علاوہ ہندی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔

> ''آخرش ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایمان و اسلام کے کاموں کا چرچہ موقوف ہوا اور اسلام کا فقط نام باقی رہ گیا اب اگر کوئی عالم دین دار اور واقف کاران کو امور مذہبیہ سے منع کرتا ہے تو بے خوف وخطر صاف کہتے ہیں کہ یہ کام تو مدت سے ہوتے آئے ہیں۔ 10

مولانا فضل رسول بدایونی:

مولانا فضل رسول بدایونی 11 (۱۷۹۸۔۹۹ تا ۱۸۷۲ء) شاہ اسمٰعیل شہید کے نظریات و عقائد کے مخالف تھے اور ان کی رد میں تصانیف تحریر کیں۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں لکھا۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اس میں انہوں نے چار کتابیں ''سیف الجبار''، ''حرز معظم''، ''فوز المبین'' اور ''فصل الخطاب'' تحریر فرمائیں۔

سیف الجبار متعدد دفعہ شائع ہو چکی ہے جب کہ دوسری تینوں کتابیں نہ تو طبع ہوئیں اور نہ ان کے قلمی نسخے ہی دستیاب ہیں۔ ممکن ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گئی ہوں۔

سیف الجبار کی زبان صاف، سلیس اور رواں ہے مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے، عربی و فارسی الفاظ کی کمی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''اس زمانے میں کہ قاضی، مفتی محتسب، خلیفہ سر پر نہ رہے، جن کا خوف ہو نفس اور شیطان نے جو آدمی کے دشمن ہیں قابو پایا، عجب طرح کا ہنگامہ برپا

ہوا کہ ہر شخص گویا دین کا ہے جو چاہتا ہے حکم کر دیتا ہے......" [۱۲]

مولوی محمد اسحاق بدایونی

مولوی محمد اسحاق بدایونی [۱۳] نہایت عابد و زاہد اور متقی بزرگ تھے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، مگر اردو زبان میں انہوں نے دو کتابیں "سراج وہاج لیلۃ المعراج" اور "ہدایۃ البرکات فی فضل لیلۃ البرأت"، لکھیں۔ میرے سامنے اس وقت آخر الذکر ہی ہے۔

شب برأت کے فضائل و اذکار سے متعلق یہ مختصر رسالہ ۱۸۵۰ء میں لکھا۔ عربی، فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال کثرت سے ہے بلکہ بڑی حد تک ترجمے کا گمان ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"معنی شب برأت کے دو طرح پر مشہور ہیں کہ برأت مخفف برأت کا ہے بمعنی بری ہونے کے۔ معنی اس ب ۱۵ شعبان میں نیک بختوں اور نیکوکاروں کو برأت و بے زاری دی جاتی ہے۔ آتش دوزخ سے اور امان اور عذاب اور تکلیف پل سراط سے اور برأت دی جاتی ہے۔ اس شب مع منکروں اور دشمنان خدا اور رسول کو جنت سے......" [۱۴]

مولوی غلام محمد خاں فرحت

مولوی غلام محمد خاں فرحت نے اردو نثر میں ایک کتاب "فرحت المومنین عزیز المسلمین" لکھی۔ دراصل اپنے ایک عزیز کو بطور وظیفہ پڑھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ننانوے نام نظم کیے اور ہر نام کے معنی اور تشریح اور اس کے فوائد و تشریحات اشعار کے نیچے اردو نثر میں لکھیں۔ یہ کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء برآمد ہوتا ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں تعقید پائی جاتی ہے۔ عربی کی طرح فعل پہلے اور فاعل و مفعول بعد میں لایا گیا ہے جس سے ترجمے کا گمان ہوتا ہے۔
اللہ کے نام سے مؤلف نے آغاز کیا ہے شعر مع نثر ملاحظہ ہو:

مجھ کو یا اللہ اپنا عشق دے   ہے عبادت صرف تیرے واسطے

"معنی نام اللہ کے مستحق عبادت کا اور موجود اور پر جمیع صفات الوہیت

کے اور نزدیک اکثر علماء کے یہ نام سب ناموں سے بڑا ہے۔ جو کوئی یا
اللہ کو ہزار بار پڑھے صاحب توفیق ہو اور جو بعد ہر نماز کے سو بار پڑھے
باطن اس کا کشادہ اور صاحب کشف ہو۔
بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے اور کسی کو مستحق عبادت کا نہ
جانے اور اس کے واسطے عبادت کرے اور اس سے اپنی حاجتیں دونوں
جہاں کی مانگے تب صفات اللہ تعالیٰ کی اس کے بیچ میں آویں۔" [16]

مولوی حکیم علی حسین بدایونی:

مولوی حکیم علی حسین [17] حمیدی خاندان کے رکن تھے جو کہ علم و فضل کے اعتبار سے بدایوں کا مشہور خاندان رہا ہے۔ یہ خاندان شاہ ولی اللہی تحریک سے متاثر رہا ہے۔ مولوی حکیم علی حسین ریاست رام پور سے وابستہ تھے۔ رام پور کے دوران قیام انہوں نے واقعہ کربلا اور فضائل اہل بیت سے متعلق ایک کتاب "چمن حسنہ حسینہ" نام سے تحریر فرمائی جسے نواب رحمت علی خاں والئ رام پور نے بہت پسند کیا اور نقد انعام سے نوازا۔ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ رضا لائبریری میں موجود ہے اس کا طرز اسلوب بھی بالکل وہی ہے جو قدما کا رہا ہے یعنی قافیہ آرائی، مضاف الیہ سے قبل وغیرہ

شاہ رؤف احمد مجددی

شاہ رؤف احمد مجددی [18] خاندان مجددی کے چشم و چراغ تھے، بلند پایہ عالم مفسر، شیخ طریقت اور خوش طبع شاعر تھے ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لوگوں کی اصلاح اور شعر و ادب کی خدمت میں گزرا اردو زبان میں شعر و شاعری کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے جو کہ تعجب خیز ہے مگر یہاں ہمیں ان کے نثری سرمائے کا ذکر کرنا ہے۔ اردو نثر میں آپ نے تین کتابیں تحریر فرمائیں۔

۱۔ مرغوب القلوب فی معراج المحبوب (المعروف بہ معراج نامہ)

۲۔ ارکان الاسلام

۳۔ تفسیر مجددی المعروف بہ تفسیرِ رؤفی

یہ تینوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مرغوب القلوب فی معراج معراج المحبوب معراج نبویؐ سے متعلق ہے۔ طرز اسلوب اور زبان کا استعمال وہی ہے جو اکثر قدما کا طریقہ رہا ہے یعنی قافیہ آرائی کا التزام مثلاً ''عندلیب گلستان احدیث بلبل بوستان صمدیت۔ ۱۹ لیکن زمین کی پستی میری بلندی پر ہستی ہے۔ ۲۰ وغیرہ

دوسری کتاب ارکان اسلام ہے جو اسلام کے پانچ ارکان کلمہ' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ پر مشتمل ہے۔ نماز کا تفصیل سے ذکر ہے جب کہ بقیہ ارکان کا ذکر اجمالاً ہے۔

اس میں بھی قافیہ آرائی کا التزام رکھا گیا ہے۔ مضاف' مضافالیہ سے قبل ہے مثلاً نماز معراج مومن کی ہے'' ۲۱

شاہ رؤف نے قرآن کریم کی تفسیر دو جلدوں میں لکھی ہے اردو زبان کی پہلی مکمل تفسیر ہے جو طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔ شاہ صاحب نے درج ذیل مصرعے سے اس کی تاریخ تالیف نکالی ہے:

''تفسیر قرآن بہ ہندی زبان ہے''۔ ۱۲۴۸ھ

انہوں نے اردو کو ہندی کہا ہے ایک جگہ ''ریختہ'' بھی کہا ہے۔ کتاب کا آغاز انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

> ''بندہ گنہگار شرمسار بد اطوار نابکار رؤف احمد بن شعور احمد...... نہ وہ عمل رکھتا ہے کہ قابل قبول تیری جناب کے ہو اور نہ وہ فضل رکھتا ہے کہ جس سے رہائی دن قیامت کے ہو''۔ ۲۲

ان کے طرز بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں:

> ''شاہ صاحب کا طرز تحریر سادہ بھی ہے اور عام فہم بھی البتہ لفظوں کی تقدیم و تاخیر کسی قدر عبارت کو اُلجھا دیتی ہے لیکن یہ اس دور کے اچھے لکھنے والوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔'' ۲۳

مولوی محمد حسن خاں رام پوری

مولوی محمد حسن خان رام پوری اپنے دور کے ممتاز عالم، مفسر، مصنف، مجاہد اور سید احمد شہید کی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز دہلوی کی فارسی تفسیر کے آخری حصے (قرآن پاک کے آخری دو پارے) کا اردو ترجمہ کیا۔

تفسیر فتح العزیز یا تفسیر عزیزی نام سے موسوم دو جلدوں پر مشتمل تفسیر لکھی۔ ۱۷۹۳ء میں شاہ عبد العزیز نے املا کرائی۔ پہلی جلد سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۴ پر ختم ہو جاتی ہے جب کہ دوسری جلد آخری دو سیپاروں سے متعلق ہے۔ ۲۵؎ مولوی محمد حسن خان نے بمبئی کے مشہور اور نہایت دین دار تاجر محمد علی روگھے ۲۶؎ کی ایماء پر پارہ عم یتساءلون کی تفسیر کا ترجمہ کیا۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

"ناؤخدا محمد علی بن حسین صاحب روگھے دام اقبالہ نے اس امر شریف کو باقیات صالحات سے سمجھ کر ایک روز فرمایا کہ اس کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں ہو کر چھپے تو لوگوں کو فائدہ ہو...... حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور بانی موصوف کی خوش نیتی کے سبب سے تھوڑے ہی دنوں میں اختتام کو پہنچایا۔" ۲۷؎

لفظ بہ لفظ ترجمے کی بجائے ہندی محاورے کو دھیان میں رکھا گیا ہے تا کہ مطلب بخوبی سمجھ میں آجائے شاہ عبدالعزیز نے ہر سورے سے پہلے بطور مقدمہ بعض ضروری امور کی وضاحت کی ہے۔ مترجم نے بھی وہی ترتیب قائم رکھی ہے۔ اس وقت کے عام رواج کے مطابق ہندی الفاظ کا استعمال ہے۔ مثلاً:

"انکھیارے"، "کڑوائی"، بدبوئی"، "دھر پکڑ"، "سنگت" وغیرہ

جمع الجمع کا استعمال بھی ہے، جیسے "احوالوں"، "اصحابوں"، "اقوالوں"، اسبابوں"، "انواروں" وغیرہ

مولوی احمد یار خاں رام پوری

مولوی احمد یار خان رام پور کے محلے پپلو کی مسجد میں رہتے تھے۔ عالم دین تھے اور ساتھ ہی

فارسی کے اچھے ادیب بھی۔ کچھ دنوں ریاست بھوپال میں ملازم بھی رہے۔ مزید حالات نہیں ملتے۔ ۲۸

انہوں نے ایک ''رسالہ احمدی در مناقب ہندی'' نام سے تحریر فرمایا۔ یہ رسالہ اُردو زبان میں ۱۸۳۰ء سے قبل لکھا گیا۔ ۲۹ یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے متعلق ہے جس میں فضائل اور ان کے مناقب و معجزات کا ذکر ہے۔ زبان سلیس ہے' کتاب کے اختتام والے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''اللہ سب مسلمانوں کو توفیق خیر کی دے خصوصاً خصوصاً اس رسالے کے جمع کرنے والے احمد یار خان گنہگار کو اور سب لوگوں کو جو اس مجلس متبرک میں بہ سبب تعظیم و تکریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حاضر ہوتے ہیں۔ محبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ان کی آل اور اصحاب کی دیوے اور مرادیں دینی اور دنیوی حاصل کروائے۔'' ۳۰

قاری حافظ فخر اللہ رام پوری

قاری فخر اللہ رام پور کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ علم قرأت میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے علم قرأت پر ایک جامع کتاب ''فخر المتعلمین'' لکھی۔ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ زبان کے اعتبار سے مقفّیٰ عبارت کا استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب میں ترجمے کا انداز لگتا ہے۔ عبارت اُکھڑی اُکھڑی سی ہے۔

مولوی حبیب النبی رقت رام پوری

مولوی حبیب النبی ۳۲ رام پور کے مجددی خاندان کے رکن تھے۔ علوم شریعت کامل دسترس اور شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ تھا۔ انہوں نے اردو زبان میں دو کتابیں ''شرح قصیدہ طحاوی'' اور ''تحفہ احمدی'' لکھیں۔

''تحفہ احمدی'' کا موضوع حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اہل بیت کے حالات

سے متعلق ہے۔ زبان کے اعتبار سے عربی تقلید کی گئی ہے۔ مثلاً فعل' فاعل و مفعول سے پہلے اور مضاف مضاف الیہ سے پہلے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

''بعد حمد وثنا کے خاک پا رسول اللہ کا اور گرد اون کی راہ کا حبیب النبی ابن ضیاء النبی بہ رقت عفی اللہ اولوالہ یہ یوں عرض کرتا ہے......... کہ میں نے تھوڑا احوال آن سرور کا اور حضرت شاہ کا اور حضرت زہرا کا اور حضرات حسنین کا مع شہدائے کربلا اس کتاب میں لکھا ہے کہ ہر آدمی اوس کو دیکھ اور پڑھ کر روئے اور تعویذ جان کا کرے اور خدا مجھ سے راضی ہووئے اور برکت اون کی اس آلائش گناہوں میرے دل سے دھووئے'' ۳۴

مولوی رشید النبی وحشت رام پوری

مولوی رشید النبی وحشت حضرت مجددالف ثانی کی اولادوں میں سے تھے۔ رام پور میں ان کا خاندان علوم شریعت و طریقت میں ممتاز تھا۔ ان کے والد اپنے عہد کے نامور شیخ طریقت اور عالم دین تھے۔

انھوں نے افادہ عام کی غرض سے ''عقائد طحاوی'' کا اردو میں شرح اور ترجمہ کیا۔ یہ کتاب عقائد سے متعلق ہے۔ انھوں نے اول لفظی ترجمہ کیا ہے پھر اُردو میں اس کی شرح بیان کی ہے عبارت صاف اور رواں ہے مگر اس میں کوئی خاص ادبی امتیاز نہیں ہے۔

رام پور کے کتب خانے میں اس کتاب کا جو خطی نسخہ ہے وہ مولف کے مسودے کی نقل ہے۔ یہ خط نستعلیق ہے' عربی متن سرخ روشنائی سے اور شرح سیاہ روشنائی سے لکھی گئی ہے۔ کتاب ۲۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

مفتی سعد اللہ مراد آبادی

مفتی سعد اللہ مراد آبادی ۳۵ اپنے دور کے نامور عالم فقیہ اور مصنف تھے۔ تمام عمر درس و

تدریس، تصنیف وتالیف اور منصب قضا سے وابستہ رہے۔ یوں تو انھوں نے عربی وفارسی میں متعدد کتابیں تحریر فرمائی ہیں مگر مندرجہ ذیل اردو رسائل ان کی یاد دلاتے ہیں:

۱۔ ترجمہ فقہ اکبر

۲۔ فضائل امام ابوحنیفہ

۳۔ وصیت نامہ امام ابوحنیفہ

۴۔ زادالسبیل الی دارالخلیل

اول الذکر تینوں ترجمے ہیں جب کہ ''زادالسبیل الی دارالخلیل'' تالیف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کی جانب منسوب رسالہ فقہ اکبر جو عقائد سے متعلق ہے' کا اردو ترجمہ مفتی سعد اللہ نے ۱۸۴۰ء میں کیا جسے لکھنو کے مختلف ناشروں نے شائع کیا۔ مفتی صاحب نے اس رسالے میں ترجمے کے ساتھ اکثر حواشی بھی لکھے ہیں۔ ترجمے میں اصل کی پوری رعایت کی گئی ہے اور لفظی ترجمے پر زور دیا گیا ہے۔ ۱۸۴۴ء میں ایک رسالہ فضائل امام ابوحنیفہ لکھ کر مفتی سعد اللہ نے ترجمہ فقہ اکبر کے شروع میں شامل کیا ہے یہ رسالہ مختصر مگر جامع ہے۔ اس میں مفتی صاحب نے مختصر سوانح، علمی کمالات اور فضائل قلمبند کیے ہیں۔

وصیت نامہ امام اعظم ابوحنیفہ دراصل عربی کتاب ہے جس میں امام اعظم کی بارہ وصیتیں ہیں۔ مفتی سعد اللہ نے عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ بین السطور کیا ہے۔ لفظی ترجمے کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۱۸۵۴ء میں مفتی سعد اللہ نے حج کیا۔ اس دوران دوستوں کی ایماء پر ایک رسالہ ناواقفوں کی رہنمائی کے لئے حج وزیارت کے مسائل سے متعلق اردو زبان میں لکھا جس کا نام انھوں نے ''زادالسبیل الی دارالخلیل'' تجویز کیا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''مستحب ہے زیارت خانہ کعبہ کی اندر سے اس طرح پر کہ ننگے پاؤں سر جھکائے ہوئے کمال عاجزی سے پشیماں اپنے برے کاموں پر توبہ و استغفار پڑھتا ہوا داخل ہو اور واسطے تماشے قندیلوں وغیرہ کے جو اوپر لٹکتی ہیں چھت کی طرف سر اٹھا کر نہ دیکھے کہ خلاف آداب ہے اور سامنے باب کے چلا جائے۔''۳۶

مولوی نواب علی محمد خاں فاروقی مرادآبادی

مولوی نواب علی محمد خاں، نواب عظمت اللہ خاں فاروقی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان ریاست و امارت اور علم و فضل میں ممتاز رہا ہے۔ [۳۷] نواب علی محمد خاں شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے فی الحال ان کی دو اردو تصانیف رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہیں جن کے نام ''مولود شریف'' اور ''غم کدہ'' ہیں۔ ''مولود شریف'' سیرت سے متعلق ہے جب کہ ''غم کدہ'' کا موضوع واقعہ کربلا ہے۔

مولود شریف میں فارسی و عربی لغات و تراکیب کا غلبہ ہے بلکہ بعض جگہ فسانہ عجائب کا رنگ پیدا ہو گیا ہے لیکن غم کدہ کی عبارت مولود شریف کے مقابلے میں قدرے صاف ستھری ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''وقت تولد آنجناب عجائب و غرائب معجزات ظاہر ہوئے تا کہ اہل دنیا ان کو دلائل صدق نبوت جانیں۔۔۔۔ شہر مدائن میں کوشک نوشیروان شق ہو گیا اور اوس سے چودہ کنگرے مسمار ہوئے آتش بت خانہ ہائے ملک فارس ہزار سال سے روشن اور اہل فارس تھی بجھ گئی'' [۳۸]
>
> ''حضرت فاطمہ نے وہ قطعہ حریر بہشت لے کر اپنے پاس رکھا اور وصیت کی اس کو بعد مرگ میرے کفن میں رکھ دینا کہ روز حشر اس سند سے اپنے باپ کی اُمت گنہگار کو بخشواؤں گی'' [۳۹]

سید محمد عباس علی مرادآبادی

سید محمد عباس ؒ کا تعلق مرادآباد کے خاندان سادات سے تھا۔ شعر و ادب کا شوق رکھتے تھے۔ اردو نثر میں انھوں نے ایک کتاب سید انشاتئین فی ذکر شہادت الحسنین لکھی ہے۔

اس کا موضوع واقعہ کربلا سے متعلق ہے جس کو نواب رام پور محمد سعید خاں کی طرف منسوب کیا ہے۔

قدماء کی طرح قافیہ آرائی، عربی کی طرح فعل پہلے، فاعل ومفعول بعد میں، مضاف مضاف الیہ سے پہلے وغیرہ اپنایا گیا ہے۔اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

نواب محمد حسن رضا خاں بریلوی

نواب محمد حسن خاں بریلوی[۴۱] حافظ رحمت خاں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے جنھوں نے اردو زبان میں کئی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ان کی تصانیف میں ''اخبار حسن''، ''عین الایمان''، ''گلشن خلافت'' اور ''ریاض النبوت'' وغیرہ ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے ''اخبار حسن'' روہیل کھنڈ اور روہیلوں کی تاریخ پر مشتمل ہے اس کی افادیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ روہیلوں کی تاریخ پر لکھی گئی یہ اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔اس سے پیشتر روہیلوں کی تاریخ پر تمام کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔

''عین الایمان'' ایمان سے متعلق ریاض النبوت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر مشتمل اور گلشن خلافت خلفائے اربعہ کے حالات زندگی پر ہے۔ زمانے کے رواج کے مطابق عبارت میں قافیہ آرائی کا خاص التزام رکھا گیا ہے۔

نواب خان بہادر خاں بریلوی

نواب خان بہادر خاں بریلوی[۴۲] ایک نامور حکمراں خاندان سے تعلق رکھنے والے کامیاب فرماں روا ہونے کے باوجود علم وادب سے شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ صاحب دیوان شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نثر نگار بھی تھے۔انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل اردو نثر میں ایک کتاب مقاصد صالحین لکھی جو کان پور، لکھنو اور لاہور سے مصنف کے نام کی صراحت کے بغیر چھپتی رہی[۴۳] موضوع کے اعتبار سے مقاصد صالحین تصوف اور اخلاق پر مبنی ہے جس میں انبیائے کرام واولیائے عظام کے حکایات وواقعات درج ہیں جس میں آیات قرآنی، احادیث، کتب، تصوف و تاریخ کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔شمائل ترمذی، مشکوۃ شریف، خلاصۃ الاحکام، گلستان اور

بوستان وغیرہ کا خاص حوالہ دیا گیا ہے۔

مقاصد الصالحین کی عبارت صاف رواں اور سلیس ہے جس میں ایک قسم کا زور اور پختگی بھی پائی جاتی ہے۔ قدیم طرز کی نثر کی طرح قافیہ پیمائی کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

''عدل یہ ہے کہ جو کچھ اپنے نفس پر قبول نہ کرے دوسرے پر بھی نہ گوارا کرے اور احسان اوس کو کہتے ہیں کہ طعام اپنا اور کو دے اور حساب بھی متعلقات عدل سے ہے یعنی جو نیک و بد کرا اوس سے ظہور میں آئے اوس پر دھیان رکھے نیکی پر شا کی اور بدی پر استغفار کرے۔'' [۴۴]

مولوی محمد سلطان خاں شاہ آبادی

مولوی محمد سلطان خاں شاہ آبادی [۴۵] شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان میں اپنی تالیفات کے ذریعے ان خیالات کی خوب اشاعت کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض اہم اور بنیادی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا' ان کی تصنیفات میں ''تذکیر الاخوان''، ''تحفۃ العجم'' (ترجمہ: کنز الدقائق) ''قصص الانبیاء فی احوال الاصفیا''، ''شرح عقائد نفسی (اردو ترجمہ)'' ''نور الایمان'' رشید المومنین' زینت مستنبطین' شجرۃ افاغنہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زبان و بیان کے اعتبار سے ان کی تالیفات خوب ہیں۔ اس لئے کہ نہایت صاف ستھری اور سلیس زبان استعمال کی ہے' نہ قافیہ پیمائی ہے اور نہ عبارت آرائی۔ وہ قوت بیان اور اظہار خیال پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ عربی و فارسی الفاظ کی کثرت بھی نہیں ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

''سب مل کر قرآن و حدیث پر عمل کرو سنت کے طریقے کے موافق مسلمان رہو اور یہود و نصاری کی طرح کئی فرقے مت ہو جاؤ اور نئی نئی باتیں نکال کر تفرقہ اور پھوٹ مت ڈالو اس واسطے کہ قیامت کو بعضے لوگ سرخرو اور بعضے روسیاہ ہوں گے تو ان روسیاہوں سے کہا جائے گا کہ تم پہلے مسلمان ہوئے اور اللہ کی کتاب قرآن کو ماننے کا تم نے اقرار کیا پھر دین میں نئی نئی باتیں رسمیں نکالیں اور بدعات کفریہ جاری کیں

تو اس سے اللہ کی کتاب کے موافق عمل کرنا چھوٹ گیا۔'' [۴۶]

حیرت ہوتی ہے کہ تقریباً آج سے ڈیڑھ سال سے بھی زیادہ عرصہ قبل (۱۸۳۴ء) مولوی محمد سلطان نے اس قدر صاف ستھری زبان استعمال کی کہ اس وقت کی مروجہ تمام لوازت کو ترک کر دیا اور زمانے کی دوری کو سمیٹ دیا۔

ملا محمد نظام شاہجہاں پوری

ملا محمد نظام خاندان [۴۷] ولی اللہی کے تربیت یافتہ تھے۔ انھوں نے اصلاح معاشرت اور دعوتی نقطہ نظر سے دو فارسی کتابوں ''مسائل اربعین'' اور ''رسالہ عقیقہ'' کا اردو ترجمہ کیا۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی کے رسالہ مسائل اربعین کا اردو ترجمہ مع شرح رفاہ المسلمین نام سے ۱۸۴۰ء میں مولوی سعد الدین عثمانی کر چکے تھے مگر وہ ترجمے سے زیادہ شرح تھی۔ چنانچہ نظام نے افادہ عام کی غرض سے مسائل اربعین کا از سر نو اردو ترجمہ کیا۔

مولوی تراب علی لکھنوی [۴۸] نے عقیقہ کے موضوع پر ایک رسالہ فارسی زبان میں عجالہ الدقیقہ فی مسائل العقیقہ نام سے لکھا۔ ملا محمد نظام نے اسی رسالے کا ۱۸۴۴ء میں ترجمہ کیا۔ کہیں کہیں توضیحی حواشی بھی لکھوا دیے ہیں۔ ترجمے میں سلاست و روانی ہے۔ نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو:

''لڑکا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے اوس کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس
نعمت کا شکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ ثابت ہوا ہے کہ اس میں اللہ کا
شکر اور لڑکے کی سلامتی کی طلب ہے۔'' [۴۹]

روہیل کھنڈ کے یہ اکیس علمائے کرام کی خدمات کا مختصر جائزہ ہے۔ تحقیق کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ مزید تحقیق کی جائے تو ممکن ہے اس فہرست میں اضافہ ہو۔ ڈیڑھ سو سال قبل کے صرف ایک خطے کے علمائے کرام کی یہ شاندار خدمات اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اردو زبان کی نشو و نما اور ارتقاء میں علماء و صوفیا کی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔ اس بات کا ہمیں اعتراف تو ہے مگر اردو نواز اور اردو شناس حضرات کو اس بات سے واقف کرانے کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

حواشی

۱۔ حیاتِ شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ٦

۲۔ مولوی عبدالمجید قادری ابن شیخ عبدالحمید عثمانی ۱۷۶۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے ظہور اللہ تاریخی نام ہے انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے پھوپھا مولوی محمد علی عثمانی بدایونی سے حاصل کی۔ ان کے انتقال کے بعد مولوی ذوالفقار علی ساکن دیوہ سے حاصل کی۔ اس عہد کے مشہور شیخ طریقت شاہ آل احمد عرف اچھے میاں مارہروی (ف ۱۸۲۰ء) سے مرید ہوئے، بعد میں خلافت سے سرفراز ہوئے۔ بدایوں میں سجادہ قائم کیا۔
تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی، ۱۹٦۲ء)

۳۔ شمالی ہند میں سیرت پر لکھی گئی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ اگر چہ دکن میں محمد باقر آگاہ (ف ۱۸۱۵ء) نے کتاب ریاض السیر اس سے قبل لکھی تھی۔ محافل انوار فی احوال سید الابرار کا قلمی نسخہ کتب خانہ مدرسہ قادریہ بدایوں میں موجود ہے۔

۴۔ محافل انوار فی لاحوال، ص ۱۹

۵۔ مولانا سلامت اللہ کشفی بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حدیث کا علم شاہ رفیع الدین دہلوی و شاہ عبدالعزیز دہلوی سے حاصل کیا۔ بدایوں چھوڑ کر پہلے لکھنو اور پھر کانپور مستقل سکونت اختیار کی۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق رہا۔ لہٰذا قتیل سے اصلاح لیتے رہے۔
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرہ عمائے ہند۔

٦۔ خدا کی رحمت، ص ۱۵

۷۔ ایضاً، ص ۱٦

۸۔ مولانا باقر بدایوں کے مشہور متولی خاندان کے رکن تھے۔ ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوا اور اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ باقر تخلص رکھا۔ نمونہ اشعار ملاحظہ ہو:

باقر دماغ شعر و سخن اب کہاں ہمیں
وہ ولولہ وہ جوش طبیعت نہیں رہا
ہمہ تن ضعف ہوگیا باقر
وہ جمال اور وہ جلال کہاں

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تجلیات سخن، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۰ اور شجرہ صدیق، نظامی پریس بدیوں۔

۹۔ مولوی سعد الدین بدایونی ابن مولوی نصیر الدین بدایونی کے مشہور عثمانی خاندان کے نامور عالم تھے۔ بدایوں کے علماء سے علم حاصل کیا ان کے اساتذہ میں مولوی عبدالمجید قادری قابل ذکر ہیں۔ وہ فقہ و فرائض میں تبحر کامل رکھتے تھے۔ انھوں نے بدایوں میں شاہ اسمٰعیل شہید اور شاہ اسحاق دہلوی کے افکار و خیالات کی اشاعت کی جس کے لئے انھیں مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

تفصیل کے لئے اکمل التاریخ، جلد اوّل، ص ۱۱۵ اور تحفۃ المسلمین، ص ۱۱۴۔۱۱۳

۱۰۔ سعادت دارین، ص ۱۰

۱۱۔ مولانا فضیل رسول نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں بعد کو فرنگی محل لکھنو سے تحصیل علم کی بعد ازاں دھول پور سے تکمیل طب کیا۔ گوالیا اور بنارس میں ملازمت کی۔ آخر میں مدرسہ قادریہ بدایوں میں تدریس کی خدمات انجام دیں۔ حجاز اور ترکی وغیرہ کا سفر بھی کیا۔

۱۲۔ سیف الجبار، ص ۳

۱۳۔ مولوی اسحاق بدایوں کے متولی خاندان کے رکن تھے۔ ابتدائی تعلیم مولانا فیض احمد بدایونی سے حاصل کی۔ مراد آباد اور دلی کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز سے محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ ۱۸۸۰ میں انتقال فرمایا۔

ملاحظہ ہو اکمل التاریخ، حصہ اوّل، ص ۲۴

۱۴۔ ہدیۃ البرکات فی فضل لیلۃ البرات، مطبع فتح گڑھ، ص ۱۸

۱۵۔ علام محمد خاں فرحت بدایوں کے قصبہ ککرالہ کے ایک زمیندر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بدایوں اور رام پور میں علم حاصل کیا۔ علم طب اشرف الحکماء، مولوی حکم عظیم اللہ ساکن قصبہ آنور ضلع بریلی سے پڑھا۔

۱۶۔ فرحت المومنین عزیز المسلمین، سید المطابع، دہلی، ۱۲۸۷ھ، ص ۵

۱۷ مولوی حکیم علی حسین بدایونی عرف انعام اللہ ابن شیخ حافظ حیات اللہ بدایوں کے مشہور حمیدی خاندان کے رکن تھے۔ ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی جب کہ تکمیل دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل کے ذریعے کی۔ علم طب بھی حاصل کیا۔ بدایوں میں فوت ہوئے ملاحظہ ہو تاریخ بنی حمید از مولوی انشاء اللہ بدایونی، امیر الاقبال پریس، ۱۹۱۷ء

۱۸۔ شاہ رؤف احمد مجددی حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے۔ ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے علوم مروّجہ کی تفصیل کے بعد شاہ گاہی رام پور کی خدمت میں حاضری دی۔ حدیث کی سند مولانا سراج احمد مجددی (۱۸۱۵ء) سے حاصل کی۔ سلوک و تصوّف میں متعدد تصانیف ہیں جو رضا لائبریری رام پور میں خطی

صورت میں موجود ہیں۔ شاہ رؤف احمد مجددی نے کچھ دنوں سرونج اور آخر میں بھوپال میں قیام فرمایا اور وہیں سے حج بیت اللہ کو گئے۔ ۱۸۳۴ء میں انتقال فرمایا۔ شاعری میں جرأت کے شاگرد تھے اور رافت تخلص کرتے تھے۔ سنٹرل لائبریری بھوپال میں مندرجہ ذیل منظوم سرمایہ خطی صورت میں موجود ہے۔ دیوان رافت، کلیات رافت، مثنوی یوسف زلیخا، مثنوی یہودی، رسالہ مولود، فقہ ہندی، جب کہ رضا لائبریری رام پور میں ایک مثنوی اسرار غیب کا مخطوطہ موجود ہے۔

۱۹۔ مرغوب القلوب فی معراج المحبوب، ص ۸

۲۰۔ ایضاً ص ۳۸

۲۱۔ ارکان الاسلام، ص ۶

۲۲۔ تفسیر مجددی، جلد اوّل، ص ۲، نامی پریس، ممبئی، ۱۸۸۷ء

۲۳۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ص ۱۴۰

۲۴۔ مولوی محمد حسن خاں رام پور کے باشندے تھے۔ ۱۸۱۴ء میں سید احمد شہید کے ہمراہ داغستان میں جہاد کیا۔ وہاں سے واپس آکر مکہ معظمہ چلے گئے، کچھ مدّت بعد وطن واپس آئے اور ممبئی میں قیام کیا۔ ۱۸۶۵ء میں ہجرت کر کے دوبارہ مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو۔
شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ شید تخلص تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے۔ احمد خاں غفلت اور حبیب النبی رقت کے شاگرد تھے ان کے چار بیت مشہور ہیں۔
ملاحظہ ہو تذکرہ کاملان رام پور، احمد علی خاں شوق، ص ۳۵۴، ہمدرد پریس دہلی، ۱۹۲۹ء اور انتخاب یادگار، منشی امیر احمد مینائی، تاج المطابع لکھنؤ

۲۵۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے محمد عضد الدین صاحب نے تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں ایک مقالہ تحریر فرمایا۔
ملاحظہ ہو معارف اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۶۷ء

۲۶۔ محمد علی روگھے ممتاز تاجر، دینی علوم سے واقف اور متعدد جہازوں کے ملک تھے اس لئے ان کا لقب "ناخدا" پڑ گیا۔ انھوں نے ممبئی کی جامع مسجد میں مدرسہ محمدیہ قائم کیا۔ ۱۹۲۴ء میں محمدی کے نام سے ایک اخبار جاری کیا اور مسلمانوں کے متعدد فلاحی اداروں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔
ملاحظہ ہو تذکرہ قوم کوکنی حصّہ اوّل، عبدالمجید خاں بوبیرے ممبئی ۱۹۲۶ء ص ۳۱

۲۷۔ تفسیر فتح العزیز پارہ عم (اردو) کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند، ۱۳۷۳ھ

۲۸۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ، ص ۱۴۵

۲۹۔ رام پور کے کتب خانے میں اس کتاب کے دو نسخے اور دونوں پر اس کا نام رسالہ احمدی در مناسب محمدی

درج ہے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اس کا نام رسالہ مولود شریف رکھا ہے۔ جامع مسجد ممبئی کے کتب خانے میں بھی اس کتاب کا ایک نسخہ ہے۔ حامد اللہ ندوی نے اس کا نام سیرت النبی لکھا ہے۔ (اردو مخطوطات' ص ۴۰)

۳۰۔ رسالہ احمدی در مناقب ہندی' ص ۴۷

۳۱۔ قاری فخر اللہ ولد شیخ محمد اسلم رام پور کے باشندے حافظ قرآن' علم قرارت و تجوید میں ماہر تھے۔ انھوں نے مروجہ علوم مفتی شرف الدین رام پوری سے حاصل کیے اور علم قرارت رام پور کے ممتاز قاری محمد نسیم (ف ۱۷۹۹ء) سے پڑھا۔ ملاحظہ ہو تذکرہ کاملان رام پور۔ ص ۳۱۳۔ اور علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اوّل' ص ۲۷

۳۲۔ مولوی حبیب النبی ۱۷۹۳ء میں رام پور میں پیدا ہوئے علوم کی تحصیل اس وقت کے رام پور کے مشہور علماء مولوی غلام جیلانی رفعت' مولوی جمال اور مفتی شرف الدین و مولوی نو الاسلام سے کی مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بھی سند یافتہ تھے اور وہاں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۸۴۵ء میں کلکتہ میں انتقال فرمایا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انتخاب یادگار' ص ۱۵۸

تذکرہ کاملان رام پور' ص ۱۰۱ اور علم و عمل' جدول آول' ص ۷۸

۳۳۔ تحفہ احمدی' خطی نسخہ لائبریری رام پور' ص ۳

۳۴۔ مولوی رشید النبی مجددی رام پور میں پیدا ہوئے۔ پہلے حفظ قرآن کیا پھر رام پور میں نامور علماء سے علوم کی تحصیل کی کلکتہ میں مدراس اور ہوگلی کے مفتی رہے۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حافظ اکرام اللہ احمد ضیغم (ف ۱۸۲۹ء) کے شاگرد اور عبدالغفور نساخ مؤلف تزکرہ سخن شعراء کے استاد تھے۔ عین عالم جوانی میں انتقال ہو گیا۔ ملاحظہ ہو: تذکرہ کاملان رام پور' احمد علی خاں شوق ہمدرد پریس دہلی' ۱۹۲۹ء اور تذکرہ سخن شعراء عبدالغفور نساخ' نول کشور پریس لکھنو' ۱۸۸۲ء

۳۵۔ مفتی سعد اللہ ولد شیخ نظام الدین ۱۸۰۴ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مراد آباد رام پور اور نجیب آباد میں حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی کا رخ کیا جہاں مفتی صدر الدین آزردہ سے استفادہ کیا۔ پھر ۱۸۲۳ء میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مجلس میں شرکت کی۔ ۱۸۲۷ء میں لکھنو پہنچے۔ وہاں مولوی اسمٰعیل' مرزا حسن علی محدّث اور مفتی ظہور اللہ سے تکمیل علم کی۔ ۱۸۳۴ء میں مدرسہ شاہی لکھنو سے وابستہ ہو گئے۔ منصب افتاء کو بھی زینت بخشی۔ ۱۸۵۴ء میں حج کیا۔ اسی سفر میں شیخ جمال مکی سے سند حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے نواب قبل یوسف علی خاں نے رام پور بلایا اور عہدہ قضا نوازا۔ شعر شاعری کا ذوق تھا

آشفتہ تخلص تھا، ۱۸۷۷ء کو رام پور میں انتقال فرمایا۔

۳۶۔ زاد السبیل الی دار الخلیل، مفتی سعد اللہ مراد آبادی، ابو العلائی پریس، حیدر آباد، ص ۵۱۔

۳۷۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء

۳۸۔ مولود شریف، رضا لائبریری، رام پور، ص ۳

۳۹۔ غمکدہ، رضا لائبریری، رام پور، ص ۵

۴۰۔ سید محمد عباس علی مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ مراد آباد اور رام پور میں تحصیل علم کیا۔ پہلے عدالت منصفی مراد آباد میں وکیل رہے پھر ریاست رامپور میں محکمہ رجسٹری میں محرر اوّل ہوئے۔ شاعری میں مولوی امین الدین امین اور مولانا کفایت علی کافی کے شاگرد تھے زیادہ تر نعت و منقبت کہتے۔ نمونہ کلام:

اے خالق ارض و سما دیدار احمد کا دکھا
ہردم یہ تجھ سے ہے دعا دیدار احمد کا دکھا
درگاہ میں تیری یہی ہے التجا عباس کی
دن رات اور صبح و مسا دیدار احمد کا دکھا

ملاحظہ ہو: انتخاب یادگار، مفتی امیر احمد مینائی، تاج المطابع لکھنو، ۱۲۹۷ھ اور تذکرہ شعرائے رام پور (خطی) جاری فانتون فرانسی، رضا لائبریری، رام پور۔

۴۱۔ نواب محمد حسن رضا خاں والی روہیل کھنڈ حافظ رحمت خاں کے پڑپوتے تھے۔ ان کے دادا نواب اللہ یار خاں زبردست عالم و محقق تھے، جنھوں نے پشتو اور اردو زبان کا لغت تیار کیا تھا۔ نواب حسن رضا خاں نے بریلی و لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اپنی تصنیفات میں جابجا اشعار نقل کیے ہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حیات حافظ رحمت خاں از الطاف علی بریلوی، کراچی، ۱۹۶۳ء

۴۲۔ روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کے پوتے نواب خاں بہادر خاں نے تحصیل علم بریلی و لکھنؤ میں کی۔ اگست ۱۸۱۵ء میں صدر امین مقرر ہوئے، فن شاعری میں جرأت کے شاگرد تھے معروف تخلص تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علاقہ روہیل کی زمام حکومت سنبھالی۔ روہیل کھنڈ پر دوبارہ انگریزوں کے قبضے کے بعد ان کو گرفتار کیا گیا اور ۲۴، مارچ۔ ۱۸۶۰ء کو پرانی جیل (بریلی) میں پھانسی دی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

۴۳۔ ملاحظہ ہو 'العلم' کراچی، ستمبر ۱۹۵۶ء

۴۴۔ مقاصد صالحین، ص ۹۵

۴۵۔ مولوی محمد سلطان خاں شاہ آباد ضلع ہردوئی کے رہنے والے تھے۔ شاہ جہاں پور کے نامور عالم مولوی عبدالجبار خاں نے تعلیم حاصل کی۔ سرکاری ملازمت میں رہے، مگر کچھ مدت پر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ملاحظہ ہو: نامہ مظفری (تاریخ شاہ آباد) حصہ دوم، ص ۴۲، مطبع مجتبائی لکھنؤ، ۱۹۱۷ء

۴۶۔ ملاحظہ ہو: نامہ مظفری اور تحفۃ العجم۔

۴۷۔ ملا نظام ولد واجد علی شاہ جہاں پور میں ۱۷۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ شاہ جہاں پور کے مشہور علما مولوی بہاء الدین اور مولوی کلن خاں سے علم حاصل کیا اس کے بعد رام پور گئے اور وہاں کے نامور اساتذہ سے علوم کی تحصیل کی، علم حدیث کی تکمیل دہلی میں شاہ ولی اللہ کے خاندان میں کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا جس کے نتیجے میں مصائب اور پریشانیوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ۱۸۹۰ء میں انتقال فرمایا۔ ملاحظہ ہو تاریخ شاہجہاں پور، حصہ دوم، ص ۱۸۲

۴۸۔ مولوی تراب علی لکھنوی ۱۷۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ علمائے لکھنؤ سے تحصیل علم کی تمام عمر درس و تدریس و تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا۔ قصبہ محمد آباد (ضلع اعظم گڑھ) میں فوت ہوئے۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ملاحظہ ہو تزکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۸

۴۹۔ رسالہ عقیقہ، مطبع محمدی لکھنؤ، ۱۲۶۰ھ، ص ۶

☆☆☆

(سہ ماہی رسالہ جامعہ، نئی دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۱ء)

مجروحؔ کا تغزل

غزل کے بارے میں ایک عرصہ تک لوگ غلط فہمیوں کا شکار رہے کسی کو وہ اخلاق خراب کرنے کا ذریعہ نظر آئی تو کسی نے اس کو محض عشق و عاشقی کی داستان سمجھ لیا اور بعض کو اس میں گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی باتوں کے علاوہ اور کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دیتی لیکن غزل نے اپنی تابنا کی اور وسعت مضامین سے لوگوں کے نقطہ نظر کو بدل ڈالا اور یہ ثابت کیا کہ اس نے نہ صرف تہذیبی اور معاشرتی نشیب و فراز کا ساتھ دیا ہے بلکہ ذہنی اور جذباتی تقاضوں کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس میں گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی باتیں ضرور ہیں لیکن ان کے پردے میں اس نے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ معاشی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کی تصویریں بھی کھینچی ہیں۔ بدلے ہوئے حالات کے زیر اثر افراد کی جذباتی اور ذہنی کیفیات کے نقشے بھی بنائے ہیں۔ زمانے کے ہاتھوں پیدا ہونے والے نت نئے افکار و خیالات کی عکاسی بھی کی ہے۔ غرض یہ کہ اس نے ہمیشہ زندگی اور اس کی رنگا رنگ بدلتی ہوئی کیفیات کا ساتھ دیا ہے۔

چنانچہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب کہ ہندوستان کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات نے ایک لمبی کروٹ لی تو افسردگی اور مایوسی کے وقت میں غالب نے غزل کو جدت اور فنی زندگی عطا کی جس میں حالات اور ماحول کو اپنی گرفت میں لینے کی تمنا نظر آتی ہے اس کے ساتھ ساتھ زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر شدت سے غور و فکر کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ لہٰذا فکر غالب نے غزل کو وسیع و ہمہ گیر بنا کر ایک نئی راہ دکھائی۔ حالات کے اسی پس منظر میں حالی نے

غزل میں نئے امکانات کا شعور پیدا کیا اور وسعت مضامین کی جانب توجہ دلائی۔ آگے چل کر بیسویں صدی کے ربع اول کے انقلابی ماحول اور سیاسی حالات میں اقبال اور چکبست نے غزل کو نئی دنیا سے روشناس کرایا اور نیا انداز و نیا آہنگ دیا پھر حسرت، جگر، اور فراق نے عشق کے روایتی تصور اور رومانیت و جذباتیت کے ساتھ ساتھ حقیقی انسانی تصور پیش کیا، جس میں سماجی پس منظر کی بھی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کے بعد زندگی اور اس کی کشمکش کو سمجھنے کا خیال اور ایک نئے نظام کے قیام کی تمنا کا اظہار غزل کے ذریعہ جن حضرات نے کیا ان میں فیض، مجاز، احسان، حفیظ ہوشیار پوری، جذبی، مجروح اور ناصر کاظمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات نے غزل کو حیاتی نزاکتوں سے محروم کئے بغیر غزل کی معنوی سرحدوں کی توسیع کی کوشش کی۔ یہاں پر صرف مجروحؔ کی غزلوں کا فنی وفکری جائزہ لینا مقصود ہے۔

مجروحؔ سلطانپوری کی شاعری کے دو اہم دور ہیں ایک ۱۹۴۵ء سے قبل جب وہ ادب کی سماجی افادیت کے قائل نہیں تھے اور دوسرا دور اجنتا اور ایلورا کی سیاحت سے شروع ہوتا ہے اس وقت ان کی شاعری میں انقلابی کیفیت پیدا ہوگئی اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کی غزل کو نئی سمت عطا کی۔ تاہم مجروح آغاز سے ہی کلاسیکی آئین وادب کے قائل رہے ہیں۔ چنانچہ شروع میں بڑی پُر لطف اور بھر پور غزلیں کہیں جن میں پرانے تغزل کا سارا رچاؤ مہذب آراستگی اور خیال آفرینی کی لطافتیں ملتی ہیں۔

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں بانہیں

ہم قفس ! صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آہی گیا

مجروحؔ کی غزلوں کی ایک اہم خصوصیت مرقع سازی بھی ہے جس کے لئے وہ تمام ساز اور آہنگ روایات اور قدیم ورثہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی غزلوں کی تزئین محض

تراکیب یا تشبیہ سازی سے عبارت نہیں بلکے سجیلے پن اور البیلے پن کا نام ہے۔

اس نظر کے اُٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

جمال صبح دیا، روئے نوبہار دیا
مری نگاہ بھی دینا خدا حسینوں کو

ان اشعار میں تشبیہ سے کم اور استعارے سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ نیز مرقع سازی کی پوری کوشش ہے ہم آواز حرفوں سے ترنم و آہنگ بھی پیدا کیا ہے۔ مجروح کی غزل کا یہ بنیادی طریق کار ہے۔ مجروح کی غزلوں میں جمالیاتی انبساط اور حظ کا وہ پہلو نمایاں ہے جس میں پاکیزگی ہے سرمستی بھی ہے لیکن آلودگی نہیں ہے۔

دل سادہ نہ سمجھا ما سوائے پاک دامانی
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

یہاں لذت پرستی اہم نہیں بلکہ وقار حسن اور جمال کی روشنی اہم ہے۔ یہ انسانی تعلقات کا ایک لطیف مرحلہ ہے جسے مجروح مرقع ساز اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

مجروح کے یہاں بھی عشق کا ایک تصور ہے جو ان معنوں میں منفرد ہے کہ انہوں نے معشوق کو رفیق زندگی اور رفیق سفر بنا کر پیش کیا ہے جو دیگر ترقی پسند شعرا کی خصوصیت رہی ہے:

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

مجروح کی غزلوں میں نیا موڑ اس وقت آیا جب انہوں نے اپنی غزلوں کو نئے خیالات،

سماجی کشمکش اور انقلاب کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ انتہائی جوش اور ولولے کے ساتھ سماجی مساوات اور ''اشتراکیت'' کا پیغام اپنی غزلوں کے ذریعہ دیا۔

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی ملک ہمارا ہو کے رہے گا
لینن کے پیغام کی جے ہو اسٹالن کے نام کی جے ہو
جے ہو اس دھرتی کی جس پر اپنا اجارہ ہو کے رہے گا

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

میری نگاہ میں ہے ارض ماسکو ''مجروح''
وہ سر زمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

سرخ انقلاب آیا دورِ آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

اور یہ تو ان کا انتہائی مشہور شعر ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مندرجہ بالا اشعار مجروح کی انقلابی ذہنیت کی غمازی کر رہے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مجروح نے اپنی غزلوں سے وہی کام لیا جو اکثر شعرا نظموں کے ذریعہ لیتے رہے ہیں۔ انہوں نے سیاسی اور سماجی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرایہ میں ڈھال لیا ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے غزل گو شعرا کا انداز بیان سیاسی اور سماجی موضوعات کے سلسلے میں ایسا ہو جاتا ہے کہ نظم اور غزل کا فرق باقی نہیں رہتا۔ لیکن مجروح کا فن یہ ہے کہ مخصوص الفاظ کے ذخیرہ میں نئے الفاظ کا اضافہ کرتے ہوئے بھی نہیں گھبراتے مثلاً:

من چلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کا رخانے سے
جبیں پر تاج زر، پہلو میں زنداں بینک چھاتی پر
اُٹھے گا بے کفن کب یہ جنازہ ہم بھی دیکھیں گے

اس طرح کی اپنی غزلوں کو مجروح "نئی غزل" کہنے پر اگر اصرار کرتے ہیں تو یقیناً بجا ہے۔ یہی وہ رنگ ہے جو انہیں عام غزل گو شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ اپنے اس پیغام کی بنا پر جو غزل کے ذریعہ لوگوں کو دے رہے تھے۔ کچھ مدت کے لئے مجروح کو جیل بھی جانا پڑا مگر اس کے بعد ان کی شاعری میں نکھار بلکہ دھار آ گئی جس کی تیزی تلوار سے بھی زیادہ تھی یہ دھار دار غزلیں مجروح کے علاوہ فیض اور جذبی کو چھوڑ کر شاید ہی کسی کے یہاں نظر آئیں۔ چنانچہ بمبئی کے بائی کلہ اور ارتھر روڈ جیل میں انہوں نے جو غزلیں کہیں ان کا رنگ لب و لہجہ ملاحظہ ہو:

بول کچھ بول مقید لب اظہار سہی
سرِ ممبر نہیں ممکن تو سرِ دار سہی
آنے دے باغ کے غدار مرا روزِ حساب
مانگے تنکا نہ ملے گا یہی گلزار سہی

یہ جبر سیاست یہ انساں مظلوم آہیں مجبور فغاں
زخموں کی مہک داغوں کا دھواں مت پوچھ فضائے زنداں میں

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

یہاں دردمندی ہے لیکن مایوسی نہیں عزم ہے اور یہ نئی حسیت اور نئے انقلابی نظریے کے نئے شعور کی غزل کی رمزیت میں سمونے کا کمال ہے۔ مجروح کی زبان سے تحریک بول رہی تھی جس میں وقار کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی تھا۔ لیکن تحریک کے کمزور ہوتے ہی ان کا لہجہ بھی دھیما ہو گیا، اس سے قطع نظر مجروح غزل کے کلاسیکی لہجے کے رمز شناس تھے اور جس طرح سجا سنوار کر وہ غزل کہتے تھے وہ انہیں کا حصہ تھا۔

(ماہنامہ ایوان اردو، دہلی، ماہ مئی ۲۰۰۱ء)

سرسید مرحوم اور مولانا قاسم نانوتویؒ

ایک دوسرے کی نظر میں

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں سرسید مرحوم اور مولانا قاسم نانوتویؒ کے نام انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور ہنگامہ خیز واقعہ نے برصغیر کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورتحال کو ایک نئی کروٹ دی۔ لوگوں کے اذہان بُری طرح متاثر بلکہ مجروح ہو چکے تھے اور اس ناکامی کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ مغل شہنشاہیت کے رعب و دبدبہ کا طلسم ٹوٹ گیا اور یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کی ''حکم کمپنی بہادر کا'' نافذ ہو چکا ہے۔ انگریزوں کے ظلم وتشدد اور ہر موڑ پر عتاب کا نشانہ بننے والے خصوصاً مسلمان ہی تھے جنھیں گوروں نے اقتدار سے محروم کر دیا تھا۔ یہی نہیں انھیں ہر جگہ امتیاز کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کو پسماندگی، افسردگی اور احساس محرومی سے نجات دلانے کے لئے مصلحین نے قدم اٹھایا اور بڑے خلوص وتندہی سے اپنے اپنے طور پر حالات کو درست اور اسباب کو دور کرنے میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ ایسے ہی لوگوں میں سرسید مرحوم اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے نام نہ صرف قابل ذکر ہیں بلکہ ہندستانی مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کی نشاۃِ ثانیہ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

سرسید مرحوم مسلمانوں کے تمام مسائل کے حل کی درستگی جدید تعلیم میں تلاش کرتے ہیں جبکہ مولانا قاسم نانوتوی اس کے لئے احیائے علوم دین کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اول الذکر انگریزوں سے تعلقات کو استوار کرنے کے خواہاں ہیں جبکہ آخر الذکر انگریزوں سے کسی بھی طرح کی معاونت کو

مضر گردانتے ہیں۔ سید صاحب نئے علوم کے ساتھ جدید تہذیب کو بھی اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ تا کہ معیار زندگی بلند ہو اور احساس کمتری سے نجات ملے، اس کے برعکس حضرت نانوتویؒ علوم دین کے ساتھ اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کو سودمند کہہ رہے ہیں حقیقی معنوں میں یہی مسلمانوں کی بقا کا ضامن ہے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نانوتویؒ کے رفقاء نے سید صاحب کے تعلیمی مشن کی مخالفت کی یا سید صاحب نے نانوتویؒ کے نقطہ نظر اور ان کی جدوجہد کو غیر ضروری سمجھا۔ ہاں سید صاحب کی مخالفت ہوئی بلکہ شدید مخالفت ہوئی اور ان کی ذات کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ لیکن ارباب دیوبند کا اس سے تعلق نہ تھا۔ مخالفت کرنے والوں میں دو نام قابل ذکر ہیں ایک ڈپٹی کلکٹر مولوی امداد العلی دوسرے مولوی علی بخش خان سب جج گورکھپور حالی حیات جاوید میں رقم طراز ہیں۔

> ''مدرستہ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رعب ہونے کے علاوہ علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے ایک مولوی امداد ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جج گورکھپور۔ اگر چہ دونوں حضرات مذہبی عقائد وخیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا باوجود اس کے مدرسہ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہم زبان اور متفق الکلمہ تھے'' [1]

فتویٰ کی مہم انھیں دونوں حضرات نے چلائی تھی۔ دونوں لوگ فتوؤں کی آڑ میں سرسید کو خارج از اسلام کہتے تھے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جن حضرات نے فتویٰ دیا ان کے سامنے سرسید کی ذات نہیں تھی بلکہ استفسار کے گئے عقائد ملحوظ خاطر رہے۔ لیکن ان دونوں حضرات نے فتوؤں کے ساتھ سرسید کے نام کو جوڑ کر ان کی ذات کو نشانہ بنایا۔

سرسید مرحوم اور مدرسہ دیوبند

سرسید مرحوم کو کسی دینی درسگاہ سے بالکل اختلاف نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جدید علوم کے ساتھ علوم دینیہ کی بھی اشاعت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مدرستہ العلوم علی گڑھ میں اس کا شعبہ بھی قائم کیا۔ مدرسہ دیوبند کے وہ ہمیشہ حامی رہے ہیں اور اس کی کامیابی چاہتے تھے چنانچہ جب مدرسہ دیوبند کے مہتمم مولانا رفیع الدین صاحب نے سرسید کے پاس مدرسہ کی سالانہ رپورٹ بھیجی جس میں مدرسہ کی طرف سے مسلمانوں کی بے توجہی اور غفلت کا رونا رویا گیا تھا تو اس کو پڑھ کر سرسید کے دل پر بہت اثر ہوا۔ چنانچہ یکم رجمادی الثانی ۱۲۹۰ھ کے تہذیب الاخلاق میں ''عربی مدرسہ دیوبند اور مسلمانوں کا جھوٹا دعویٔ دینداری'' کے عنوان سے تین صفحہ کا مضمون لکھا۔ یہ ایک درد بھری تحریر ہے۔ جس میں مسلمانوں کی بے حسی پر اظہار افسوس کیا ہے' وہ لکھتے ہیں۔

> ''اول بلحاظ مسلمانوں کے جوش مذہبی کو ہم سمجھتے تھے کہ جو مدرسہ ہم قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس میں علوم انگریزی اور دیگر علوم دنیاوی بشمول علوم دینی پڑھائیں گے اس پر متعصب دیندار اعتراض کرتے ہیں اور اس کو کرسٹانی مدرسہ ٹھہراتے ہیں اور اسی سبب سے لوگوں کو اس میں چندہ دینے سے منع کرتے ہیں تو عربی مدرسہ دیوبند جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس میں وہی پرانے علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کو مسلمان چاہتے ہیں بڑے بڑے مسلمانوں نے ضرور مدد کی ہوگی رپورٹ کو دیکھنے سے ہم کو نہایت مایوسی ہوئی مسلمانوں پر نہایت افسوس ہے کہ ایسے مدرسے میں جیسا کہ دیوبند کا عربی مدرسہ ہے اور جس میں مولوی محمد قاسم سا فرشتہ سیرت شخص نگران ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب سا شخص مدرس ہے' کچھ مدد نہ کریں۔'' [۲]

آگے طلبہ کی تعداد، صلاحیت اور انعامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''قوم کا مسلمانی مدرسہ اور ایسی خراب اور محتاج حالت میں ہے کہاں ہیں بڑے بڑے دینداری کا دعویٰ کرنے والے؟ اور کیوں مذہب

اسلام کے مدرسہ کو ایسی حالت میں ڈال رکھا ہے۔ ہماری غرض اس
تحریر سے مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلانا ہے کہ ان کے دونوں
کام دین و دنیا سب خراب و ابتر ہیں ان کو چاہیے کہ اس مدرسہ کی ایسی
مدد کریں اور ایسی اعلیٰ ترقی پر پہنچائیں جو اسلام کی رونق و شان کا نمونہ
ہو۔'' [۳]

مولانا قاسم نانوتویؒ اور جدید تعلیم

۱۸۵۷ء سے قبل عربی مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء سرکاری ملازمتوں میں لئے جاتے تھے۔ انقلاب ۵۷ء کے بعد صورتحال یکسر بدل گئی۔ عربی مدارس کے بجائے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے سند حاصل کرنے والے ہی سرکاری ملازمتوں میں لئے جانے لگے چنانچہ عربی مدارس میں جدید علوم پڑھنے کے باوجود ملازمتوں میں لیا جانا ناممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا قاسم نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند میں جدید علوم سے صرف نظر کر کے اسلامی علوم کو ہی نصاب میں رکھا۔ ان کا کہنا تھا۔

''جدید علوم کو پڑھنا چاہیں ان کو انگریزی اسکولوں میں جانا چاہیے دونوں
طرح کے علوم کی مخلوط تعلیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طالب علم کسی بھی فن میں درجہ
کمال حاصل نہیں کر سکتا نہ اسے جدید علوم حاصل ہوں گے نہ قدیم۔'' [۴]

مولانا قاسم نانوتویؒ نے یہ فیصلہ انگریزی تعلیم سے نفرت کی وجہ سے نہیں بلکہ دینی تعلیم میں خامی و نقصان کے اندیشے سے فرمایا تھا۔ جدید علوم کے حاصل کرنے سے مولانا نانوتویؒ نے کبھی منع نہیں فرمایا اور نہ ہی اس کی مخالفت کی سرسید مرحوم سے ان کے قریبی روابط تھے چنانچہ ان کی تعلیمی تحریر کے خلاف کبھی ایک لفظ نہیں کہا۔ انہیں یقین تھا کہ اس تعلیم سے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو یقیناً فائدہ پہنچے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کبھی کسی زبان کے سیکھنے سے نہیں روکتا بلکہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے اس خیال سے سرسید مرحوم بھی بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق یکم ذی الحج ۱۲۹۰ھ میں مضمون بعنوان ''مدرسہ دیوبند میں مولانا قاسم کی تقریر اپنی

علوم قدیم اور جدید پڑھانے کے بارے میں'' درج ہے۔جس پر سرسید مرحوم نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ مدرسہ کے کسی سالانہ مجلس میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب نے ایک نہایت طبعی، دل میں اترنے والی اور صداقت سے بھری ہوئی گفتگو کی اس کے پڑھنے سے ہم کو اس بات کی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جناب مولوی صاحب بھی مسلمانوں کے حق میں علوم وفنون جدیدہ حاصل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت نانوتویؒ کو جدید علوم سے نفرت نہیں تھی اور نہ ہی اس کی تحصیل کو نقصان دہ سمجھتے تھے۔البتہ بعض مصالح کی بناء پر وہ مدارس خصوصاً مدرسہ دیوبند میں جدید علوم کو شامل کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک مسلمانوں کی معاشی آسودگی سے زیادہ اہم مسئلہ ہندستان میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور اسلام کی تہذیب وتمدن کی بقاء اور اس کے وجود کو ممکن بنانا تھا۔

دونوں کی شخصیت ایک دوسرے کی نظر میں

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ سرسید کی ذات کو ارباب دیوبند نے کبھی بھی طنز وتعریض اور ملامت کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ ان کے کام، خلوص اور مسلمانوں کے تئیں ہمدردی کو ہمیشہ سراہا ہے لہٰذا حضرت نانوتویؒ سرسید کی تعریف میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

> ''سید صاحب کے اولوالعزمی اور دردمندئی اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے'' [5]

اس طرح سرسید مرحوم بھی حضرت نانوتویؒ کے دل سے معتقد تھے۔مولانا قاسم نانوتویؒ کے انتقال پر بہت لوگوں نے تعزیتی تحریریں لکھیں لیکن جو تحریر سرسید نے لکھی وہ بے مثل ہے شاید کسی اور نے ایسی تعزیتی تحریر نہ لکھی ہو یہ اس بات کی غماز ہے کہ سرسید مرحوم اور حضرت نانوتوی میں کس قدر تعلق تھا۔یہ تحریر علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء کے صفحہ نمبر ۶۸ ۴ پر شائع ہوئی اس کے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں سرسید لکھتے ہیں۔

''افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ) نے ۱۵/
اپریل ۱۸۸۰ء کوضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیو بند انتقال فرمایا۔
زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص
کے لئے جس کے بعد اس کا کوئی جانشیں نظر نہ آئے تو نہایت رنج وغم
اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔'' ۶

ان کے کمال بزرگی کا اعتراف کرتے ہوئے اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں۔

''مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ
اور ورع اور مسکینی سے ثابت کردیا کہ اس دلّی کی تعلیم و تربیت کی
بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا
ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔'' ۷

مدرسہ دیوبند کو ان کی یادگار بتاتے ہوئے اس سے مکمل تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔

''دیوبند کا مدرسہ ان کی نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض
ہے کہ ایسی کوششیں کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس
کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر انکی یادگاری کا نقش جمارہے۔'' ۸

الغرض سرسید مرحوم اور حضرت نانوتویؒ میں بعض اختلافات کے باوجود مقصدیت میں بڑی حد تک یگانگت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ایک دوسرے کے لئے عزت و احترام اور توقیر کا جذبہ پیدا کیا اور ان دونوں کے خلوص وللّٰہیت اور ہندستان میں مسلمان اور اسلام کے مستقبل کی فکر نے ہی علی گڑھ اور دیوبند کو وہ مقام عطا کیا اور اس نے وہ خدمات انجام دئے کہ کوئی بھی ان دونوں کی ہمسری نہ کرسکا۔

ہماری آواز' شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی' میرٹھ کا ادبی مجلّہ ۲۰۰۳ء پہلا شمارہ

☆☆☆

عہد نو میں سر سید کی معنویت

ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم مصلح سر سید کی پیدائش 17/اکتوبر 1817ء کو دہلی میں ہوئی۔ 1857ء کے انقلاب یا جنگ آزادی کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انگریزوں کی جانب سے ہندوستانیوں پر ڈھائے گئے مظالم پر بھی ان کی نظر تھی۔ یہ ایسا وقت تھا جب معاشرے میں جمود طاری ہو چکا تھا۔ توہم پرستی کا غلبہ اور لامرکزیت کا دور دورہ تھا۔ مسلمان افسردگی اور ذہنی کشمکش کے شکار تھے۔ اس زبوں حالی اور کسمپرسی کو دیکھ کر سر سید کا دردمند دل تڑپ اُٹھا اور مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی و تعلیمی بیداری کے لئے حکمت عملی تیار کر لی۔ زندگی کے تمام شعبوں پر تنقیدی نظر ڈالی کھرے کھوٹے کو پرکھا۔ بڑی اخلاقی جرأت دلیری اور بے باکی سے وہ باتیں سامنے رکھ دیں جن کو وہ سچ سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے زوال پذیر معاشرہ میں سر سید کے ساتھ بھی سب کچھ ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ کسی مصلح کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ ان کو کافر، ملحد، دجال اور لامذہب وغیرہ کے خطاب دیئے گئے کفر کے فتوے لکھے گئے۔ ان کے خلاف پروپگنڈے میں مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور پیش پیش تھے۔ اخباروں میں اودھ پنچ اخبار ان کے خیالات کو مسخ کر کے بڑی بھیانک تصویر پیش کرتا تھا۔ لیکن سر سید تھے نہایت متحمل مزاج اور زندہ دل چناں چہ جب کسی اخبار میں ان پر تنقید نہ ہوتی تو تعجب کرتے اور کہتے "ہمارا حال اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے ہیں اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے"۔ سر سید ایک دفعہ حیدرآباد تشریف لائے تو ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے کے لئے ایک کثیر مجمع موجود تھا۔ مولوی اکبر جو حیدرآباد کے نہایت ممتاز اور با اثر اشخاص میں سے تھے۔ آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا۔ "لوگ آپ کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ آپ کے

پاس کیا نشانی ہے۔ سرسید نے داڑھی اُٹھا کر اپنی رسولی دکھادی۔

سرسید نے مذہب، سیاست، معاشرت، ادب کے ساتھ ساتھ دیگر اصلاحی اقدامات کئے لیکن ان کے کام کی پوری توجہ کا مرکز تعلیم تھا۔ سرسید غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ مسلمان کی ذلت و رسوائی کا علاج جدید تعلیم میں ہے۔ یہ ساری آفت مصیبت، پسماندگی اور محرومی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ سرسید کے لئے یہ مرحلہ بڑا سخت تھا۔ کیوں کہ مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے سخت نفرت تھی۔ جن میں عوام وخواص دونوں شامل تھے۔ چناں چہ سرسید مرحوم نے جب جدید تعلیم کی جانب قدم بڑھایا تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان برپا ہوگیا۔ لوگوں کا عام طور پر یہ خیال اس عہد کے تناظر میں کسی حد تک درست تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ مغربی تعلیم خصوصاً سائنس کے مطالعہ سے نوجوانوں کے عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں اسی خطرے کی روک تھام کے لئے سرسید کو مذہبی مسائل میں دخل دینا پڑا۔ چناں چہ تفسیر قرآن اور بے شمار مذہبی مضامین لکھ کر لوگوں کی ذہن سازی پر مجبور ہونا پڑا۔

سرسید کو دو محاذوں پر جدو جہد کرنی پڑی ان کا دوسرا مقابلہ انگریزوں سے تھا۔ جنہوں نے اسلام پر رکیک حملے اور سخت اعتراضات کئے۔ سرسید نے اپنی تحریں کے ذریعہ ان کا بڑی خوبصورتی سے جواب دیا۔ انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے جو بدظنی اور عداوت جاگزیں تھی اس کو دور کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی موجودہ صورتِ حال میں چند شر پسند عناصر اور تنظیموں کی جانب سے جو عداوتوں اور نفرتوں کا ماحول تیار کیا جارہا ہے اس میں ہمیں اپنے احساس ذمہ داری کے لئے سرسید کی سیرت کے اس گوشہ اور ان کے افکار سے بڑی تقویت ملتی ہے اور ہمارے لئے اس میں ایک پیغام بھی ہے۔

سرسید ہندوستانیوں کے وقار کو مجروح ہوتا ہوانہیں دیکھ سکتے تھے۔ چناں چہ انگریزوں کے ذریعہ کسی ہندوستانی کے ساتھ امتیازی برتاؤ یا بدسلوکی کی خبر سنتے یا دیکھتے تو بے چین ہو جاتے۔ 1867ء میں آگرہ کے دربار سے اس بات پر خفا ہو کر چلے آئے کہ وہاں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی نشست میں امتیاز برتا گیا ہے۔ حالاں کہ اس دربار میں انہیں طلائی تمغہ ملنے والا تھا۔ علی گڑھ میں واٹسن کلکٹر ہو کر آیا جو کسی ہندوستانی کو جوتا اُتارے بغیر اپنے کمرے میں نہیں آنے دیتا تھا۔ سرسید نے اس سے ملنا گوارا نہیں کیا۔

تعلیم اور مذہب کے علاوہ معاشرت میں بھی انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سرسید

کی معاشرتی اصلاح کے دو پہلو ہیں۔ اول یہ کہ انہیں اس بات کی کوشش کرنی پڑی کہ ایسی تمام عادتوں کو لوگ ترک کر دیں جو سماجی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بننے کا اندیشہ پیدا کر رہی ہو۔ دوم یہ کہ لوگ ہر حال میں سائنٹفک نقطہ نظر کو دھیان میں رکھ کر قدم بڑھائیں۔ سرسید مرحوم نے ''تہذیب الاخلاق'' کی ایک اشاعت میں 29 نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا ہے جس سے ان کے افکار و نظریات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ منجملہ ان تمام کے جس پر وہ زیادہ زور دیتے ہیں وہ ہے آزادی رائے۔ ان کا کہنا ہے کہ آزادانہ رائے دینے کے اختیار سے دنیا کی آدھی برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی سید صاحب کے نزدیک آزادی رائے کو سب سے زیادہ نقصان مذہبی تعصب سے پہنچا ہے کسی مذہب پر اعتراض کیا جاتا ہے تو اس مذہب کے ماننے والوں کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔

سید صاحب کے خیال میں مذہبی عقائد کی درستگی کے بغیر کسی قسم کی معاشرتی اصلاح ناممکن ہے۔ بہت سی رسمیں جڑ پکڑ چکی ہیں جن کو مذہب کا جز خیال کیا جاتا ہے۔ ان کو ترک کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ وہ دین و دنیا کی تفریق کو تباہ کن کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا اور دین میں ایسا مستحکم رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ جس طرح بدبختی سے دنیا دین کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔

سرسید نے عبادت کی تشریح بھی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عموماً مروجہ طریقوں میں عبادت کا مفہوم یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ بدن کو جتنا مجاہدہ اور ریاضت میں ڈالا جائے وہی عبادت کو ممتاز بناتی ہے۔ سرسید نے اس مفہوم کو غلط بتاتے ہوئے کہا کہ زہد اور ریاضت ایک بخیل نیکی ہے جو صرف اپنی ذات کے لئے کی جاتی ہے۔ اس کی مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ جیسے کوٹھری میں بیٹھ کر کھانا کھائے اور صرف اپنا پیٹ بھرے لیکن عام لوگوں کی بھلائی چاہنے والا حاتم کی سخاوت جیسا ہے جو ہزاروں آدمیوں کو کھلاتا ہے۔ خدمت خلق سرسید کے نزدیک سب سے بڑی عبادت ہے۔

سید صاحب نے خود اعتمادی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ کوشش سے بگڑے کام اور حالات دوبارہ سدھر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کی لگاتار کوششوں سے ہندوستانی مسلمانوں کا کھویا ہوا اعتماد کسی نہ کسی حد تک دوبارہ بحال ہوا۔

ان کے خیال میں خود اعتمادی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ہم دوسروں کے دست نگر نہ ہوں بلکہ اپنے مسائل آپ حل کرنا سیکھیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب ''اپنی مدد آپ'' کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اپنی مدد آپ سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ترقی کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق خود کسی بیرونی امداد کا انتظار کئے بغیر کوشش کرے۔ ان کے نزدیک ''اپنی مدد آپ'' کرنے کا جوش سچی ترقی کی بنیاد ہے۔ اور اگر یہی جوش بہت سے شخصوں میں پایا جائے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ بن جائے گا۔ اس سلسلے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں۔

''سید احمد کے سماجی اور اخلاقی افکار کی دوسری سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ''اپنی مدد آپ'' کے اصول پر زور دیتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی بھی سماج اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک وہ اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل نہ کرے فلسن سریز میں سید احمد کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے اپنی مدد آپ کے اصول سکھائے''

تہذیب الاخلاق میں سرسید لکھتے ہیں۔

> ''سچا اور نہایت مضبوط مسئلہ جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی وہ اپنی مدد آپ کرنا ہے جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لائیں گے تو خضر کو ڈھونڈنا بھول جائیں گے اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو''۔

سرسید احمد خان سماج سے ان تمام برائیوں کو ختم کر دینا چاہتے تھے جو انسانیت اور قوم کے لئے نقصان دہ ہیں۔ مثلاً کاہلی، خوش آمدانہ انداز، تقلیدی پرستی، ریاکاری، ظاہرداری، قومی نفاق، تعصب، مصنوعی زبان، گروہ بندی، ناشائستہ گفتگو اس طرح کی تمام چیزوں سے سرسید کو سخت نفرت تھی سرسید کی باتیں تجدیدی کارنامے اور افکار و نظریات صرف انھیں کے عہدے کے لئے مخصوص نہیں تھے۔ بلکہ آج کے بے یقینی اور بحرانی کیفیت والے دور میں بھی لوگوں کو اتنی ہی اپیل کرتی ہیں بلکہ ہر دور میں کرتی رہیں گی جتنی کہ عہد سرسید میں کی۔

(17/ اکتوبر 2003 کو میرٹھ یونیورسٹی کے سیمینار میں پڑھا گیا مقالہ)

مولانا اسمٰعیل میرٹھی درسی کتب کے آئینہ میں

ہر زمانہ اور ہر زبان کے ادب میں بچوں کے لئے لکھا جاتا رہا ہے جس کا مقصد بچوں کا دل بہلانا یا تفریح کا سامان مہیا کرنا نہیں بلکہ ان کی ذہنی نشو ونما اور تربیت کے لئے عمدہ سرمایہ فراہم کرنا ہوتا ہے، اردو ادب میں بھی بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے ان لکھنے والوں کی صف اول میں محمد حسین آزاؔد، شبلؔی، حالؔی، نذیر احمد اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے نام قابل ذکر ہیں ان تمام میں موخر الذکر کو کئی لحاظ سے اولیت تو نہیں فوقیت کا درجہ حاصل ہے۔

مولوی اسمٰعیل میرٹھی سے قبل بچوں کے لئے درسی کتب لکھنے کی جو کوشش کی گئی ان میں منشی ذکاء اللہ اور مولوی محمد حسین آزاد کی کاوش قابل توجہ ہیں۔ منشی ذکاء اللہ نے سائنس اور ریاضی سے متعلق کتابوں کی سیریز مرتب کی جبکہ محمد حسین آزاد نے ابتدائی فارسی اور اردو کی چار حصوں پر مشتمل کتابیں مرتب کیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلہ میں سب سے کامیاب تجربہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے کیا جنہوں نے محمد حسین آزاؔد کی طرح اردو کی چار کے بجائے پانچ حصوں پر مشتمل کتابوں کو مرتب کیا جو کئی لحاظ سے بہتر اور اب تک کی انوکھی و مقبول کتابیں رہی ہیں۔ ایک خاص بات یہ رہی کہ اردو کی جو پانچ درسی کتابیں مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے تیار کی تھیں ان میں اردو کی پہلی کتاب کے بجائے اردو قاعدہ کو اس سلسلے کی پہلی کڑی قرار دیا تا کہ بچوں کے ذہن تک شروع ہی میں آسانی سے مواد پہنچا دیا جائے۔ اس کی مثال آج کے اسکولوں کے L.K.G سے دی جاسکتی ہے۔

مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے اردو زبان کی پہلی کتاب شمالی و مشرقی صوبوں کے سررشتۂ تعلیم کی

تجویز پر تالیف کی تھی۔ پہلی بار یہ ستمبر ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی ۱۹۵۷ء میں جب یہ نولکشور پریس سے چھپی تو اس سے قبل اس کے ۹۲ اڈیشن نکل چکے تھے اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس کتاب میں ۱۲۳ اسباق ہیں سترھویں سبق تک بڑی مہارت سے مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے اردو گرامر کی اصطلاحیں اور اس کی تعریف کو بغیر نام لئے کتاب کا متن بنالیا ہے۔

کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ عبارت میں پیراگراف پر نمبر ڈالے گئے ہیں جس سے معنوی تسلسل پیدا ہو گیا ہے۔ سبق بستی کے سطور دیکھئے۔

''آدمی اپنے رہنے کے لئے گھر بناتے ہیں جہاں بہت سے مکان بن جاتے ہیں وہ بستی کہلاتی ہے۔''

''چھوٹی بستی کو گاؤں بڑی کو قصبہ اور بہت بڑی کو شہر بولتے ہیں''

''امیروں کے محل بڑے اور پکے ہوتے ہیں۔ غریبوں کے چھونپڑے چھوٹے اور کچے ہوتے ہیں''

مولوی اسمٰعیل میرٹھی زبان کے معاملے میں سخت گیر نہ تھے بلکہ لچک کو پسند کرتے تھے کتاب کے آخر میں چند صفحات زراعت سے متعلق عنوانات قائم کر کے معلومات بہم پہنچائی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی یہاں کے بچوں کے لئے کاشتکاری اور گاؤں کی زندگی کا علم ضروری سمجھتے تھے کیونکہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔

اردو کی دوسری کتاب میں موضوعات کا تنوع ہے۔ ساتھ ہی نظموں کی تعداد بھی بڑھادی ہے جن میں خود مؤلف کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ ہر سبق کے آخر میں یاد کر و ہجے اور معنی کے تحت چند مشکل الفاظ دیئے گے ہیں۔ اس کتاب میں مختصر کہانیوں کے ذریعہ اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ بعض کہانیوں میں جانوروں کی زبان سے نصیحتیں بالکل کلیہ دمنہ کی طرح دی گئی ہیں پھر کہانی کا نتیجہ کسی شعر، قطعہ یا چند اشعار میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی نظموں میں بھی کہانیاں سنائی گئی ہیں جن میں سے بعض نظمیں انگریزی اور فارسی کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔ اس کتاب میں مؤلف کی نظم ''گائے'' بڑی مقبول اور قومی یکجہتی کی بہترین مثال ہے۔

اردو کی تیسری کتاب میں انسان اور جدید علوم کو اہمیت دی گئی ہے پانی کی شکلیں، دھات، ہوا، پانی، غذا، لباس، موسم، زمین، مکان اور غسل وغیرہ پر مختصر مضمون لکھے ہیں کتاب کا آغاز مؤلف کی نظم خدا کی تعریف' سے ہوتا ہے اس کتاب میں بھی مولف نے اشعار کو شامل کر کے دلچسپی بڑھا دی ہے اس میں ایک خط تحریر کیا گیا ہے جس کے ذریعہ بچوں کو خط لکھنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ اس میں شامل نظموں میں ''دال کی فریاد'' ندرت لئے ہوئے عجیب وغریب نظم ہے۔

اردو کی چوتھی کتاب کا آغاز مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی نظم خدا کی قدرت سے کیا ہے۔ اس کتاب میں تاریخی قصوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ بچوں کے بننے اور نکھرنے میں یہ تاریخی کردار اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ محمود غزنوی اور بڑھیا، سلطان ناصر الدین، سلطان جلال الدین خلجی، نور جہاں بیگم، شیر شاہ سوری، اہلیہ بائی، سیتاجی، پرتھوی راج چوہان، شہاب الدین غوری، جلال الدین محمد اکبر بیرم خاں، ابوالفضل فیضی، راجہ ٹوڈرمل اور بیربل وغیرہ کے حالات درج کئے ہیں۔ اس کتاب میں مثبت اخلاقی قدروں کے ساتھ فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے کا اہتمام کیا گیا ہے مثلاً گرمی کا موسم، صبح کی آمد، آسمان اور تارے، تاروں بھری رات جنگل اور چاندنی رات وغیرہ نظمیں دلچسپ ہیں، مصنف کو بیرونی ملکوں کی ترقی اور یورپ کے سائنسی ایجادات سے دلچسپی ہے۔ اپنی اس دلچسپی میں بچوں کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً بیلون یا غبارہ، کوئلے کی کان، دُمدار ستارے، چھاپہ خانہ، بخاری دخانی کشتی اس طرح کے اسباق ہیں۔ اس کتاب میں آرائش محفل اور مثنوی سحر البیان سے منظوم ٹکڑے بھی لئے ہیں۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ زبان سکھانے کے ساتھ ساتھ شعری ادب کو بھی داخل کیا ہے۔ ذوقؔ اور غالبؔ کی غزلیں شامل ہیں خود اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں کافی تعداد میں شامل ہیں' بارش کا پہلا قطرہ' اور' اچھا زمانہ آتا ہے' اپنے موضوع، طرزِ ادائیگی اور تاثیر کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔

اردو کی پانچویں کتاب مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی اس سلسلے کی آخری تالیف ہے۔ اس کتاب کا آغاز نظم، ''خدا رزاق ہے'' سے ہوتا ہے اس میں اخلاق کے ساتھ ساتھ ٹھوس علمی مضامین بھی شامل ہیں مثلاً حکومت، مبادلہ، تحقیق، ستارے اور کہکشاں حواس خمسہ وغیرہ قابل ذکر ہیں ایک خاص بات

یہ ہے کہ بچوں کے اندر سے توہم پرستی کو ختم کرنے کے لئے دو انتہائی اہم مضامین' بکری کا بھوت' اور باجے کا بھوت شامل ہیں۔کل ملا کر اس میں نظم کا حصہ زیادہ ہے۔آخر کے چند صفحات زراعت سے متعلق ہیں۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اردو کی یہ درسی کتب لکھ کر بچوں کے ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔مولانا کو ناول یا افسانے سے دلچسپی نہیں رہی وہ تو اپنی صلاحیتوں کو بچوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی اخلاقی تربیت پر لگاتے رہے۔وہ ایک کامیاب شاعر بھی تھے ان کا مجموعہ کلام ''کلیات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔مولانا نے ان کتابوں میں بڑی تعداد میں جو کہانیاں لکھی ہیں کچھ تو طبع زاد ہیں جبکہ بیشتر بستان حکمت اور انور سہیلی سے ماخوذ ہیں۔موضوعات کے اعتبار سے اخلاقی ،معلوماتی مضامین کے علاوہ دیگر تاریخی ، زراعتی ،طبعی اور حفظان صحت سے متعلق مضامین ہیں ۔کردار اور واقعات ایسے لئے ہیں جو بچوں کی سیرت سازی میں موثر ثابت ہوں اور ان میں انصاف'فرض شناسی ،ایفائے وعدہ ،محنت کی روزی ،حسن سلوک ،رفاہ عام ،ذہانت ،شجاعت ،مساوات ،وفاداری ، قومی یک جہتی اور علم وفضل کی عظمت وغیرہ اوصاف پیدا کر سکیں۔ہند تان کی عظیم شخصیتوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کی ممتاز شخصیتوں کا ذکر بھی ملتا ہے جس کی وجہ سے بچوں کے ذہن میں وطنیت کا محدود تصور قائم نہیں ہوتا ان کے اندر شخصیت پرستی کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا جس کی حدیں عصبیت سے مل جاتی ہیں۔طلباء میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ برے بھلے کی پہچان سچائی اور خلوص کے ساتھ کر سکیں وہ پوری انسانیت کو ایک اکائی تصور کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

(ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ' اکتوبر ۲۰۰۴ء)

☆☆☆

ماسٹر رام چندر: اُردو کی ایک نابغہ روزگار شخصیت

ماسٹر رام چندر ۱۸۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے چھ برس تعلیم حاصل کرنے کے بعد معاشی تنگی نے انھیں ملازمت پر مجبور کیا، لیکن جلد ہی ''محرومی'' کی ملازمت ترک کر کے ۱۸۴۱ء میں دہلی کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں انھیں اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔ ۲۸/ فروری ۱۸۴۴ء کو کالج میں ہی ان کا تقرر بحیثیت ریاضی کے استاد ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد وہ کالج سے علیحدہ ہو گئے اور جنوری ۱۸۵۷ء میں ٹامسن سول انجینئرنگ کالج رڑکی میں بحیثیت نیٹو ہیڈ مسٹر (Native Head Master) تقرر ہو گیا۔ رڑکی میں چند ماہ رہنے کے بعد ۱۸۵۸ء میں دہلی ڈسٹرکٹ استعمال کے ہیڈ ماسٹر بن کر دہلی آ گئے۔ ۱۸۶۶ء میں خرابی صحت کی بناء پر ریٹائرمنٹ لے لیا اور اسی سال راجہ مہندر سنگھ کے اتالیق کی حیثیت سے دربار پٹیالہ میں ملازمت مل گئی۔ ۱۸۷۰ء میں جب پٹیالہ میں سررشتہ تعلیم کا قیام عمل میں آیا تو مسٹر رام چندر اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۱/ اگست ۱۸۸۰ء کو ۵۹ سال کی عمر میں ان انتقال ہوا۔[۱]

انیسویں صدی کے ہندوستان کی علمی و سائنسی تاریخ میں ماسٹر رام چندر کا نام کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی دلچسپی کے لحاظ سے بنیادی طور پر وہ ایک ماہر ریاضی داں تھے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان سے لے کر انگلستان تک ان کی شہرت اسی علم کی وجہ سے ہوئی۔ چنانچہ ان کی مشہور ریاضی کی کتاب رسالہ مسائل کلیات و جزئیات A Treatise on the Problems of Maxima and Minima کو پروفیسر ''آگسٹس ڈی مارگن'' نے

لندن سے نہ صرف شائع کیا بلکہ اس تحقیق پر انھیں انعام کا مستحق بھی قرار دیا گیا۔ ماہر ریاضی داں کے ساتھ ساتھ مسٹر رام چندر بہترین، صحافی اور مضمون نگار بھی تھے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان کے سائنسی طرز فکر، منطقی استدلال اور تنقیدی شعور نے اردو زبان و ادب میں آئندہ آنے والی تبدیلیوں اور اضافوں کو کن حیثیتوں سے اور کتنا متاثر کیا اس کا ایک جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے ماسٹر رام چند کے سلسلے میں جو کہا ہے ممکن ہے آپ بھی اس اتفاق کریں' خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔

> ''رام چندر نے سرسید سے پہلے مضمون نگاری و صحافت، ذکاء اللہ سے پہلے ترجمہ و تاریخ اور حالی سے پہلے سیرت نگاری و تنقید شروع کی اور اس طرح ان کی حیثیت چراغ راہ کی سی ہے۔ انہوں نے نذیر احمد کی طرح نسوانی ادب مہیا نہیں کیا، لیکن مؤخر الذکر سے پہلے عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کی حمایت کی۔ انھوں نے سرسید کی طرح کوئی اصلاحی تحریک شروع نہیں کی لیکن غلامی اور محرومی کا احساس دلایا اور تہذیب الاخلاق سے بہت پہلے ''مضامین علمی'' اور پند نصیحت آگیں'' لکھ کر جو ''مفید خلقت ہندوستان'' ہوں ہماری چشم تنگ کو کثرت نظارہ سے کھولنے کی کوشش کی۔'' [۲]

اس اقتباس میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں کسی حد تک وزن ضرور ہے۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ ماسٹر رام چندر نے حالی و شبلی کی طرح سیرت و تنقید، ذکاء اللہ کی طرح تاریخ، نذیر احمد کی مانند تعلیمی و اصلاحی اور راشد الخیری کی طرح نسوانی ادب کو باضابطہ طور پر ایک تحریکی شکل تو نہیں دی البتہ یہ تمام چیزیں شعوری طور پر ان کی تحریروں میں موجود ہیں اور یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ سرسید سے قبل ماسٹر رام چندر نے افادی اور مقصدی ادب کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ان کے اسلوب میں ادب کی چاشنی نہ سہی لیکن سادگی، اختیار اور جامعیت سے کسی کو انکار نہیں۔

مراسلہ نگاری میں سادگی اور مقصدیت:

رام چندر نے مراسلہ نگاری کی قدیم روش پر سخت اعتراضات کیے اور آسان عبارت لکھنے پر زور دیا۔ دراصل خطوط میں یہ تکلفات اور ثقالت فارسی انشاء پردازی کا اثر تھا۔ اس طرز سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ یہ مرصع کاری علم و فضل کی نشانی سمجھی جاتی تھی جس میں ہر طبقہ ملوث تھا۔ ماسٹر رام چندر نے یکم جنوری ۱۸۵۰ء کو رسالہ محب ہند میں نواب واجد علی شاہ کا ایک خط نقل کیا ہے، جو انہوں نے اپنی بیوی کو لکھا تھا۔ ملاحظہ ہو:

''نامہ عنبر شمامہ، عطر آگیں، بہجت تزئیں، مفرح روح، مقوی دل، ممد جان، معاون رواں، سلسلہ محبت، وسیلہ مودت، مسکن دل نالاں و مضطر، جامع پریشاں پندرہویں ماہ صفر کو رونق افروز بزم موصول ہوا۔ کاشانہ محبت روشن اور خانہ الفت رشک وادی ایمن ہوا۔'' ۳

ماسٹر رام چندر اس طرز ادائیگی کے سخت مخالف تھے اور لکھا کہ یہ واہیات عبارات اور استعارے وضائع فارسی کے ذریعہ آئے ہیں، اسے ترک کرنے ضرورت ہے۔ انہوں نے جو خطوط لکھے، زمانہ کی عام روش سے بالکل ہٹ کر لکھے۔ آگے چل کر غالب نے بھی اسی طرز کو اپنایا۔

جدید تنقید کا آغاز:

عموماً حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو جدید تنقید کی ابتدا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن رام چندر نے حالی سے تقریباً چار دہے قبل اپنے رسالہ خیر خواہ ہند میں اردو شاعری پر تنقید کی ہے جس سے میدان میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماسٹر رام چندر کے ذریعہ بعض اٹھائے گئے سوالات اور اعتراضات کو حالی نے آگے چل کر زیادہ وضاحت اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ یکم تمبر ۱۸۴۷ء کے خیر خواہ ہند (جس کا نام نومبر ۱۸۴۷ء سے محب ہند ہو گیا) میں اردو شاعری پر تنقید کی ہے یہ تحریر انگریزی میں ہے۔ اس کے چند حصوں میں غور کیجیے۔

''شاعری کا موضوع عام طور پر عشق ہے جس کا معیار بہت پست

اور افسوس ناک ہے۔ اس کا اندازہ معشوق کے تصور سے کیا جا سکتا ہے، وہ ان شاعروں کی دنیا میں بے وفائی اور جور و جفا کا پتلا ہے۔ وہ بوالہوس، رقیب سے راہ و رسم ہی نہیں رکھتا بلکہ سچے عاشق کی ایذا رسانی سے خوش بھی ہوتا ہے۔"

۱۔ اردو شاعری میں عاشق، سودائی و مجنوں، رند خراباتی، کافر، مغموم اور دلگیر نظر آتا ہے۔

۲۔ عاشق اور واعظ میں کبھی نہیں بنتی۔ ان شاعروں نے شیخ کی بری طرح خبر لی ہے اور کوئی گستاخی ایسی نہیں ہے جو ان واعظان مذہب و اخلاق کے ساتھ روا نہ رکھی ہو۔

۳۔ ہر مصیبت اور بے علمی کا سبب چرخ نیلوفری ہے۔ ہمارے شاعر (جو عاشق سمجھے جاتے ہیں) جب کبھی معشوق کی ایذا رسانی اور بے وفائی کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا سارا الزام آسمان کی کج رفتاری پر رکھتے ہیں۔

۴۔ اردو شاعروں کی بے مذہبی مشہور ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوگا۔

"نہ بت خانہ سے کام اپنا، نہ بیت اللہ سے مطلب
میں بندہ عشق کا ہوں مجھ کو کیا ہے راہ سے مطلب
سمجھ تو دیکھ مجھ سے تجھ سے جھگڑا کیا ہے اے زاہد
تجھے تسبیح سے اور مجھ کو اپنی آہ سے مطالب" ؎

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رام چندر شعر و شاعری کی ایک محدود تصور سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کا منشاء یہ تھا کہ شاعری نئی تہذیبی شعور اپنے اندر بیدار کر کے دیگر زبانوں مثلاً انگریزی، رومی اور یونانی کی طرح موضوعات میں تنوع پیدا کریں۔

ماسٹر رام چندر اور اردو زبان و تعلیم:

ماسٹر رام چندر ملک و قوم کی ترقی میں اردو زبان کا اہم کردار مانتے تھے کیونکہ ہندوستان کے کثیر باشندوں کی زبان اردو تھی جب کہ دیگر زبانیں علاقائی درجہ رکھتی تھیں اس لیے انگریزی و سائنسی علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کے حامی تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ مادری زبان میں تعلیم دینا

زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ اکتوبر ۱۸۴۷ء کے خیر خواہ ہند میں وہ لکھتے ہیں۔

''زبان انگریزی کے ذریعہ سے اوس قدر شیوع علم مفیدہ کا نہیں ہو سکتا ہے جس قدر کہ ضرور ہے تا کہ ہندوستان کے آدمی وہ لیاوقت اور عقل کریں جو بالفعل اہل فرنگ کو حاصل ہے۔ اب جو امید ہے کہا یک دن ہند عاقل و عالی حوصلہ مثل فرنگیوں کے ہو جائیں اس باعث سے ہوتی ہے کہ علوم اور فنون کی کتابیں زبان اردو میں ترجمہ کی جائیں اور اس کی وساطت سے ہند کے آدمی علم حاصل کریں۔''

رام چندر اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنانے اور نئی تہذیب کے فروغ میں اس کی افادیت سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے نہ صرف اردو کی وسعت، لچک اور ہندوستان گیر مقبولیت و تراجم کی اہمیت پر زور دیا ہے بلکہ بے حس حکومت کو بھی اس جانب توجہ دلائی ہے کہ وہ اردو رکے ادارے اور کالج وغیرہ قائم کریں۔ وہ اعلیٰ تعلیم کو چند منتخب لوگوں کو ملک بنانا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ وہ اردو زبان کے ذریعہ سائنسی علوم کو عام کرنا چاہتے تھے ساتھ ساتھ وہ اردو کو شعر و شاعری کے دائرے سے نکل کر اس کے دامن کو وسیع کرنا چاہتے تھے جس سے ہماری زبان بھی اعلیٰ زبانوں کی صف میں شامل ہو جائے اور اعلیٰ تعلیم کا بار برداشت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ رام چندر انگریزی زبان کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ زیادہ بلکہ تمام تر توجہ ان کی اردو زبان کے ذریعہ ہی علوم کی اشاعت اور اس کے سیکھنے پر مرکوز ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ہندوستان میں کروڑہا آدمی ہیں۔ اون میں سے کس قدر خلقت نے زبان انگریزی کو تحصیل کیا ہے؟ (بہت کم نے) زبان انگریزی ایک بے گانی زبان ہے اور اسی واسطے اوس کا تحصیل کرنا مشکل تر ہے......
غرض یہ کہ زبان انگریزی کے ذریعہ سے اوس قدر شیوع علوم مفیدہ کا نہیں ہو سکتا ہے جس قدر کہ ضرور ہے۔''

ماسٹر رام چندر اس وقت یہ تحریر لکھ رہے ہیں جب انگریزی واقعی بے گانی زبان تھی اور فارسی و اردو ہی کا سکہ رائج تھا، لیکن آنے والے وقت میں تہذیبی تصادم اور سیاسی تلاطم کے نتیجہ میں لسانی

صورتِ حال نے کروٹ بدل لی۔ غرض کہ اب انگریزی زبان بے گانہ نہ رہ کر یگانہ ہو گئی اور یہ بے گانگی اردو کے حصہ میں آئی۔ بہر حال ماسٹر رام چندر اور دلی کالم سے وابستہ افراد کی یہ برابر کوشش رہی کہ تمام علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ ہی ہو۔ اس کے لیے انہوں نے تراجم کا بہت بڑا شعبہ قائم کر کے اسے عملی جامہ دینے کی کوشش کی اور مختلف علوم و فنون کی بیش بہا کتابوں کو کثیر تعداد میں ترجمہ کر کے اردو میں منتقل کیا گیا۔

ماسٹر رام چندر اور اردو صحافت:

ماسٹر رام چندر ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ انہوں نے علم کی ترویج اور شاعت نیز اپنے نظریات کے فروغ کے لیے صحافت کا بھی سہارا لیا۔ ''ڈاکٹر اشپر نگر'' نے دہلی کالج میں ایک پریس ''مطبع العلوم'' نام سے قائم کیا تھا اور کالج کے طلبہ و اساتذہ نے ''مجمع فوائد العام'' نام سے ایک انجمن قائم کی۔ ماسٹر رام چندر نے ایک پندرہ روزہ اخبار فوائد الناظرین نام سے کالج کے پریس سے نکالنا شروع کیا۔ ۲۳/ مارچ ۱۸۴۵ء کو اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا لیکن خاص بات یہ رہی کہ ۲ ستمبر ۱۸۴۵ء تک دہلی اردو اخبار کے ضمیمے کے طور پر یہ شائع ہوتا رہا جبکہ ایڈیٹر کی جگہ پر دہلی کالج کی انجمن ''مجمع فوائد العام'' لکھا جاتا تھا۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۸۴۶ء سے رام چندر کا نام بھی شائع ہونے لگا۔ یہ تبدیلی محض ضابطے کی تھی، علمی طور پر پہلے بھی رام چندر ہی اس اخبار کے ذمہ دار تھے۔

فوائد الناظرین کا مقصد جدید علوم و فلسفہ سے پڑھے لکھے لوگوں کو متعارف کرانا تھا۔ چنانچہ اس طرح کے مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ اس کا اسلوب عام روش سے ہٹ کر سادہ اور آسان تھا، لیکن مضامین طبیعات اور ریاضیات سے متعلق اتنے دقیق ہوتے تھے کہ لوگوں کو سمجھ سے باہر تھے۔ آخر میں اسے دلچسپ بنانے کی غرض سے تاریخ، اسلاف کے واقعات، سائنسی انکشافات اور استادوں کے کلام شائع کرنے لگے۔ اس کے علاوہ اہم اور دل چسپ مقامی، ملکی اور غیر خبریں بھی چھاپتے تھے مثلاً مرزا غالبؔ کی گرفتاری، مہاراجہ دلیپ سنگھ کی شکست اور پنجاب سے ان کا کوچ، یورپ میں شخص حکومتوں کے خلاف برپا ہونے والے چسپ اعداد و شمار اور انگلستان کی

پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے بجٹ بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

ستمبر ۱۸۴۷ء میں ماسٹر رام چندر نے ایک ماہانہ رسالہ خیر خواہ ہند نام سے شائع کیا مگر نومبر ۱۸۴۷ء سے اس کا نام بدل کر محبّ ہند رکھ دیا گیا کیونکہ مرزاپور سے عیسائی مشنری ایک اخبار اسی نام سے نکلتا تھا۔ اس رسالہ کا مقصد بھی تقریباً وہی تھا جو اخبار فوائد الناظرین کا تھا۔ عموماً پچاس صفحات پر مشتمل یہ رسالہ تھا۔

ڈاکٹر اشپرنگر کی ایما پر دہلی کالج سے ایک ہفتہ وار اخبار قران السعیدن نام سے جاری کیا گیا تھا۔ ماسٹر رام چندر اپنے اصلاحی، علمی، سائنسی و معلوماتی مضامین اس اخبار میں بھی لکھتے تھے۔ ماسٹر رام چندر کے بے شمار مضامین سے ہٹ کر اگر ان کی تصنیفات و تراجم پر نظر ڈالیں تو ان کی کل تعداد سترہ (۱۷) ہے، جن میں سے تیرہ (۱۳) تصانیف اور چار تراجم ہیں۔ چونکہ ماسٹر رام چندر کو ریاضی سے غیر معمولی شغف تھا اس لیے سب سے زیادہ ریاضی (Mathematics) پر چھ کتابیں، مذہب پر پانچ، طبیعات (Physics) پر دو، قانون، معلومات عامہ، تذکرہ اور رسم و رواج پر ایک ایک کتابیں ہیں۔

ماسٹر رام چندر کے کارناموں کے اس مختصر اور سرسری جائزہ کو دیکھ کر کوئی بھی شخص حیرت میں پڑے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک قلیل مدت میں ہی علم و ادب کا اتنا اہم ذخیرہ وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ میرے نزدیک ان کی تحریروں سے زیادہ ان کے افکار و خیالات کی اہمیت ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ سائنسی علوم کا ماہر ایک شخص شعر و ادب، زبان و بیان، مذہب و اخلاق، معاشرت و ثقافت اور رسم و رواج وغیرہ پر کھل کر اپنے افکار اور دوٹوک رائے کا اظہار کرتا ہے کہ لوگ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بات یہیں تک نہیں بلکہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں زبان و ادب، معاشرت اور مذہب سے متعلق جو جو اصلاحی کوششیں کی گئیں یقیناً اس کے ڈانڈے ماسٹر رام چندر سے جا کر ملتے ہیں۔ یہ "اپنی ذات میں انجمن" والی عجیب و غریب شخصیت کا کمال تھا یا کہ مٹتی ہوئی مغل تہذیب کی برکات، بہر حال اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

☆☆☆
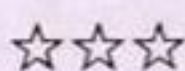
حواشی:

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (i) ماسٹر رام چندر، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (1961، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی) (ii) ماسٹر رام چندر اور نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ: پروفیسر سیدہ جعفر 1960، آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد)

۲۔ ماسٹر رام چندر، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی ص ۳۶

۳۔ قیام لندن کی یادداشتیں، تاریخ ممتاز، ص ۴ برٹش میوزیم لندن بحوالہ ماسٹر رام چندر ص ۳۴

۴ خیر خواہ ہند، یکم ستمبر ۱۸۴۷ ص ۱۔۲، ہارورڈ یونیورسٹی لائبریری، امریکہ (بحوالہ ماسٹر رام چندر)

۵۔ خیر خواہ ہند، اکتوبر ۱۸۴۷ء

۶۔ ماسٹر رام چندر، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی ص ۶۴

۷۔ ملاحظہ ہو فوائد الناظرین، جلد دوم تا پنجم ۱۸۵۰ء تا ۱۸۷۷ء۔

(ادبی مجلّہ ''فکر نو'' ذاکر حسین کالج، دہلی، ۲۰۰۵ء)

مولانا آزاد‘ پرشوتم داس ٹنڈن اور اُردو

آزادی سے قبل ہندوستان کی قومی سیاست میں مولانا آزاد کی جو خدمات ہیں اس سے ہر کوئی واقف ہی نہیں بلکہ معترف بھی ہے۔ البتہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد نے جو تعلیمی اصلاحات‘ مختلف اکیڈمیوں کے قیام اور ثقافتی اشتراک کے فروغ میں کار ہائے نمایاں انجام دیے وہ نہ صرف تاریخ کا حصہ ہیں‘ بلکہ اب تک ان کے قائم کردہ خطوط میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ مولانا آزاد نے ایسے نازک وقت میں کام کیا جب فرقہ واریت کا عفریت مشترکہ تہذیب کو نگلنے کے لیے تیار بیٹھا تھا اور اس تہذیب کی سب سے بڑی علامت یعنی اُردو زبان‘ نرغہ میں آچکی تھی۔ ایسے لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر اس زبان کی وکالت وحفاظت کی ان میں مولانا آزاد کا نام نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے؟ چنانچہ ۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء کو ہندوستانی پارلیمنٹ میں مولانا آزاد نے جس طمطراق اور اعتماد کے ساتھ اردو کے مخالفین کا منہ توڑ جواب دیا تھا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزاد نے اپنی وزارت کے اصلاحی اقدامات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی وزارت نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے متعلق کچھ تجاویز منظور کی ہیں۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے اس بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہ بنیادی قسم کی ہوگی۔ یونیورسٹی کی تعلیم پر بھی حکومت نے غور کیا ہے جس میں ثانوی تعلیم خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اصل خرابی وہیں ہے چونکہ ثانوی تعلیم کے بغیر یونیورسٹی کی تعلیم جاری نہیں رہ سکتی اس لیے ضرورت محسوس

کی گئی کہ ثانوی تعلیم میں اصلاح کی جائے اسی مقصد کے تحت مشاورتی بورڈ نے نومبر میں ایک کمیٹی اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے تشکیل دی ہے جس نے جنوری میں اپنی سفارشات پیش کردی ہیں بورڈ نے اسے منظور کر کے ٹھوس اقدامات اٹھائے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ اصلاحات کے لیے کچھ نہیں ہورہا ہے بے معنی ہے۔ آج کل نکتہ چینی کرنا فیشن سا ہوگیا ہے اگر ریاستی حکومتوں نے تعاون کیا تو ہم تعلیمی نظام کو بہتر بنا سکیں گے۔ جہاں تک یونیورسٹی تعلیم کی اصلاحات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ایک کمیشن UGC نام سے قائم ہو چکا ہے جو اصلاحات کی طرف تعمیری قدم اٹھائے گا۔

پرشوتم داس ٹنڈن سے خطاب: آگے مولانا آزاد ٹنڈن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جہاں تک تعلیمی اصلاحات کا تعلق ہے میں ٹنڈن جی سے کہوں گا کہ آپ اپنے دماغ کو تکلیف نہ دیجئے بلکہ یہ کام دوسروں کے لیے چھوڑ دیجئے (ٹنڈن جی دراصل ہندی کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ تیار ہو کر آئے تھے)۔ مولانا آزاد نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ معاملہ اہم ہے، مرکزی حکومت کا فرض ہے کو پورا کرے کہ پندرہ برس کے بعد سرکاری زبان دیوناگری رسم الخط میں جاری ہو جائے۔ میں خوش ہوتا اگر ٹنڈن جی یہ بتلاتے کہ اس سلسلے میں جو پروگرام بنایا گیا ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ان کو کچھ تجاویز بھی پیش کرنی چاہیے تھیں لیکن افسوس ہے۔ جس طریقہ پر انھوں نے اپنی تقریر شروع کی اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کوئی تعمیری تجاویز پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں انہوں نے اپنے دماغ میں ایک مخالفانہ نقشہ تیار کیا اور اس کی بنیاد پر اپنا مقدمہ بنایا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ وزارت تعلیم جو مدد دے رہی ہے وہ ہندی کے لیے نہیں بلکہ ہندوستانی کے لیے دے رہی ہے اور یہ خیال انہوں نے اس لیے ظاہر کیا کہ جب دستور ہند میں زبان کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی تو یہ ہندوستانی کے حق میں تھا۔

مسٹر ٹنڈن (غصہ میں کانپتے ہوئے) آپ مجھے غلط طور پر پیش کررہے ہیں میں نے یہ کہا تھا کہ اس وزارت میں تناسب کا احساس نہیں ہے آپ غصہ میں اپنا توازن کھو رہے ہیں۔ اس کے جواب میں مولانا آزاد نے صرف یہ فرمایا کہ آپ میرے غصہ کی فکر نہ کیجئے۔

ڈپٹی اسپیکر: آنریبل ممبران مہربانی فرما کر چیئر کی طرف مخاطب ہوں اور آپس میں بحث نہ

کریں۔ مولانا آزاد نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ٹنڈن جی الزام دیتے ہیں کہ وزارت تعلیم ہندی کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہے بلکہ اس کا جھکاؤ ہندوستانی کی طرف ہے یہ سرتا پا غلط ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ انہوں نے یہ الزام لگا کر کہاں تک دیانت داری سے کام لیا ہے۔ ٹنڈن جی نے یہ بھی کہا کہ حکومت ہندوستانی پر چارنی سبھا کو مدد دے رہی سے ظاہر ہے کہ اس میں ہندی کا نام تک نہیں ہے اور انہوں نے اسی لیے اس کا نام لیا ہے کہ سننے والوں کے دماغ پر اس کا یہ اثر پڑے کہ حکومت ہندی کی نہیں بلکہ ہندوستانی زبان کی ہمت افزائی کر رہی ہے۔ یہ ایک پُر فریب تخیل ہے۔

پرشوتم داس ٹنڈن (غصہ میں آپے سے باہر ہو کر انگریزی میں)

مولانا صاحب وزیر ہو سکتے ہیں لیکن اتنے ایماندار نہیں جتنا کہ میں ہوں جو کچھ میں نے کہا وہ پُر فریب نہیں بلکہ خود ان کی تقریر پُر فریب ہے انہیں زندگی گزارنے کا طریقہ مجھ سے سیکھنا چاہیے۔

(کچھ دیر کے لیے شور وغل اور ہنگامہ) بہت سے کانگریسی ممبروں نے ان الفاظ کی واپسی کا مطالبہ کیا اور بعض نے زور کے ساتھ کہا کہ یہ الفاظ غیر پارلیمانی نہیں ہیں۔

مولانا آزاد: یہ الفاظ بالکل غیر پارلیمانی نہیں ہو سکتے۔

مسٹر الگور شاستری: پرشوتم داس ٹنڈن کے متعلق وزیر موصوف نے دو لفظ استعمال کیے ہیں ایک غیر ایماندارنہ اور دوسرا پُر فریب تخیل دونوں لفظ غیر پارلیمانی ہیں جنھیں واپس لیا جائے۔

مولانا آزاد: ایک ممبر کو یہ کہنے کا حق ہے کہ دوسرے ممبر نے حقائق ایماندارنہ طور پر نہیں رکھے۔ پرفریب کے معنی ہی ہیں کہ جس چیز کو پیش کیا گیا وہ صاف اور واضح نہیں تھی۔

مسٹر شاستری: اگر ہمارے سینئر وزراء کا رویہ ایسا رہا تو گالیاں شروع ہو جائیں گی۔

مسٹر ٹنڈن: میں نے مولانا کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ انہیں بھی گالیاں بھرے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہیئے۔ (مسٹر ٹنڈن: نے اس موقعہ پر طنزاً یہ بھی کہا کہ الفاظ کے معنی وزیر اعظیم سے پوچھے جائیں۔)

مسٹر شاستری پُر فریب کے معنی ہے دغاباز

مسٹر کرشنا نائر: پرفریب کا مطلب گمراہ کن کے علاوہ کچھ نہیں۔

مولانا آزاد: بہر حال مجھے ان الفاظ پر اصرار نہیں ہے۔ مولانا نے اپنے الفاظ واپس لے لیے اور پھر تقریر شروع کی۔ میں ہندوستانی پرچارنی سبھا کا ذکر کر رہا تھا یہ جماعت گاندھی جی نے بنائی تھی ٹنڈن جی بھی اس میں شریک تھے جب اختلاف ہوا تو الگ ہو گئے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد اس کے صدر ہیں اور گاندھی جی کے تمام پیرو کار اس میں شامل ہیں۔ گاندھی جی کے بعد ڈاکٹر راجندر پرساد نے میٹنگ بلائی اور کہا کہ یہ جماعت گاندھی جی کی یادگار ہے اسے باقی رہنا چاہیے پھر اس کی امداد کے سلسلے میں ڈاکٹر راجندر پرساد نے توجہ دلائی لیکن انہوں نے اس کے لیے جس قدر رقم کی سفارش کی وہ بہت زیادہ تھی مگر پھر بھی اس کے لیے ایک رقم منظور کی۔

(چند منٹ کے لیے شور غل اور ہنگامہ)

ایک ممبر: یہ ٹنڈن جی اور گووند داس جی آخر کیوں خاموش نہیں رہتے۔

کچھ شبلی اکیڈمی کے بارے میں: مولانا نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ٹنڈن جی کو شبلی اکیڈمی کی امداد پر اعتراض ہے کیونکہ اس اکیڈمی نے کثیر تعداد میں اردو کی کتابیں شائع کی ہیں اور اس ادارہ کا تعلق کانگریس سے بھی رہا ہے۔ تقسیم وطن کی وجہ سے اکیڈمی کے کاروبار پر منفی اثر پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکیڈمی کے ایک وفد نے پنڈت نہرو سے ملاقات کر کے درخواست کی کہ اگر 60 ہزار روپے کی رقم مل جائے تو معاملات کو درست کر لیں گے۔ نہرو جی نے ایک سفارشی خط وزیر تعلیم کو لکھا کہ یہ سوسائٹی اچھے کام کرتی ہے اور یہ اچھی بات نہ ہوگی کہ تھوڑے روپیہ کی وجہ سے بند ہو جائے اگر ایسا ہوا تو پاکستان بھی پروپیگنڈہ کرے گا کہ ہندوستان میں اب ایسی حالت ہوگئی ہے کہ اس قسم کی سوسائٹی بھی قائم نہ رہ سکی۔

اس کے بعد مولانا آزاد نے کہا کہ میں حیران ہوں کہ اگر ایک مرتبہ ساٹھ ہزار روپیہ کی امداد ایک اردو سوسائٹی یا کمپنی کو زندہ رہنے کے لیے دے دی جائے تو اسقدر تکلیف ہو یہ انتہائی افسوس ناک مقام ہے کہ جو زبان اس ملک کی زبان ہے اس کے لیے دماغ اتنا تنگ ہو جائے۔

اردو سب کی زبان ہے: یہ کسی ایک مذہب یا جماعت کی زبان نہیں بلکہ یہ ہندو مسلمان

اور سکھ کی زبان ہے اور اگر فرض کر لیجئے کہ مسلمانوں ہی کی زبان ہے تو آخر ساڑھے چار کروڑ مسلمان اس ملک میں بستے ہیں ایسی سوسائٹی جو قیمتی خدمت انجام دے رہی ہے کیا اس کی امداد دینا اعتراض کی بات تھی کیا محض اس وجہ سے کہ ایک تاریخ اردو میں لکھی گئی یہ اسلامی کلچر ہو گیا۔ ٹنڈن جی جیسے لوگ جو ہندی کی کوشش میں نظر آتے ہیں وہ ہندی سے محبت میں نہیں بلکہ اردو دشمنی میں یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں بلکہ اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اونچا کرو نہ یہ کہ دوسروں کو نیچا کیا جائے جہاں تک شمالی ہند کی بات ہے ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو اس کے خلاف ہو اور اگر کہیں رکاوٹ ہے تو میں کہوں گا کہ وہ تنگ نظری کی رکاوٹیں ہیں۔

(تالیاں بجتی ہیں)

جنوبی ہند میں ہندی کی مخالفت کیوں؟ مجھے یاد ہے کہ مدراس میں ایک سوسائٹی نے تمل زبان میں انسائیکلوپیڈیا کا کام اسی ہزار روپیہ میں شروع کیا تھا یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو پریشانی کا باعث ہوتی۔ لیکن محض اس جذبہ سے کہ دوسری زبانوں کو دبایا جائے اس کی مخالفت کی گئی یہ جذبہ بالکل غلط ہے اس سے ہم ترقی نہ کر سکیں گے۔ آج اگر جنوبی ہند میں ہندی کے خلاف کچھ جذبہ ہے تو اسی مذکورہ پالیسی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں کسی زبان کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہر زبان کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہئے۔ بلاشبہ ہم نے ہندی کو قومی زبان تسلیم کیا ہے اور ہمیں اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دینا چاہیے۔ لیکن اگر وہی رویہ رہا تو یقیناً رکاوٹ پیدا ہوگی۔

میں لیپا پوتی کی باتیں نہیں کر رہا ہوں اس قسم کی باتیں وہ کرتا ہے جس میں کوئی غرض کا مادہ پایا جاتا ہو میرے اندر کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نے اب سے 46 برس پہلے اپنی زندگی کا ایک پروگرام بنایا تھا اس وقت سے آج تک میری زندگی کھلی ہوئی کتاب ہے زندگی کا بڑا حصہ ختم ہو چکا ہے تھوڑا باقی ہے وہ بھی قریب الختم ہے (جس وقت مولانا نے یہ الفاظ فرمائے تو پورے ایوان پر سناٹا چھا گیا) جس نے اپنے دل سے غرض نکال دی وہ بے پناہ ہو جاتا ہے بے پناہ کا شاید آپ مطلب نہیں سمجھے۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی جس کو کوئی تلوار نہ کاٹ سکے۔ تلوار اس جسم پر چلتی ہے جس میں غرض ہو۔ اگر غرض نہیں ہے تو کوئی تلوار اس کو نہیں کاٹ سکتی۔

پاکستان کا قیام: مسلم لیگ نے دوقومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ کیا اور ایک بڑی مصیبت سے ہم دوچار ہوئے۔ لیکن جتنی ذمہ داری پاکستان کے قیام کے لیے رجعت پسند مسلم فرقہ پرستوں پر ہے اتنی ہی ذمہ داری اس قسم کے دماغوں (ٹنڈن جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پر ہے کیوں کہ اس طرح کی تنگ نظری سے دوسروں کو موقع ملتا ہے اور وہ لوگوں کو مشتعل کرتے ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ ہندو دماغ کی نمائندگی یہ لوگ نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ لوگ کرتے ہیں جو گاندھی جی کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ میں مسلمانوں سے لڑا ان کے دماغوں کو درست کیا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ جب تک تنگ دلی سے کام لیا جاتا رہے گا ہم ترقی نہیں کر سکتے بلکہ اس سے الٹا نقصان ہوگا۔

ٹنڈن جی نے شبلی اکیڈمی اور ہندوستانی پرچارنی سبھا کا ذکر تو کیا لیکن ''ہندی ساہتیہ سمیلن'' کو چالس ہزار کی امداد دی جارہی ہے اس کا ذکر نہیں کیا اور ''ناگرک پرچار سبھا'' کا بھی ذکر نہیں کیا جس کو ایک لاکھ روپیہ دیا گیا۔ اپنے استدلال کی جو اینٹیں ٹنڈن جی چن رہے تھے ان میں یہ اینٹ نہیں تھی۔

سیٹھ گووند داس کو جواب: اب میں تھوڑا وقت سیٹھ گووند داس کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے لوں گا (معمولی قہقہہ) انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہندی کی راہ میں صرف دو رکاوٹیں ہیں اول انگریزی اور دوم اردو۔ انگریزی کے متعلق انہوں نے کہا کہ میں ان لوگوں کو جو انگریزی کے حامی ہیں میکالے کا بچہ سمجھتا ہوں (شرم شرم کے نعرے) سیٹھ گووند داس (آپے سے باہر ہو کر نہایت غصہ میں) کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے لیکن جو کچھ انہوں نے کہا وہ شور وغل اور ہنگامہ میں دب کر رہ گیا۔

مولانا آزاد پر سیٹھ جی نے چیخ چیخ کر اعتراض کیا کہ وزارت نے سائنس کے لیے بین الاقوامی اصطلاحات کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں برطانیہ گیا' فرانس گیا کہیں بھی بین الاقوامی اصطلاحات جاری نہیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا لندن میں ''چیرنگ کراس'' پر کھڑے ہو کر انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ بین الاقوامی اصطلاحات ان ممالک میں رائج

نہیں ہے۔ یہ فیصلہ یونیورسٹی تحقیقاتی کمیشن نے کیا ہے۔ اس نے یہ سفارشات کی تھی کہ سائنس کی بین الاقوامی اصطلاحات کو منظور کرلیا جائے۔ حکومت نے ایک بورڈ بنایا تھا جس نے کمیشن کی سفارشات کو منظور کرلیا اب سیٹھ جی سے پوچھوں گا کہ ان اصطلاحات کے بارے میں کیا سائنس داں ڈاکٹر بھٹنا گر اور ڈاکٹر گھوش جیسے ماہرین کی رائے لی جائے یا سیٹھ گووند داس کی۔ وہ بتائیں کہ کتنے منٹ انہوں نے سائنس کی دنیا میں بسر کیے ہیں۔

پندرہ سال میں ہندی: اب میں ایوان کا وقت زیادہ نہیں لوں گا صرف ہندی کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ ہندی کو پندرہ برسوں میں لایا جائے حکومت کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ اس کام کو پورا کرے۔ مگر یہ ایک مشکل کام ہے۔ بعض طبقوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پانچویں برس بعد ہی کیوں نہ ہندی میں کام شروع کردیا جائے اس قسم کا خیال غلط ہے۔ پہلے پانچ سال کا پروگرام تو اصطلاحات کے لیے بنایا گیا اور اس میں تین برس گذر چکے۔

مولانا آزاد کی تقریر کے بعد اعتماد کی تحریک پر ووٹ لیے گئے اور وزارت تعلیم کے مطالبات تالیوں کی گونج میں منظور کرلیے گئے۔ تالیاں بجانے والوں میں خود پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک تھے حالاں کہ یہ ان کی عادت کے خلاف تھا۔

(۱۱ر نومبر ۲۰۰۵ء کو اردو یونیورسٹی کے قومی نیشنل سمینار میں پڑھا گیا مقالہ)
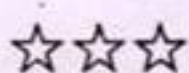
ماریشس میں اردو کا ایک خاموش خادم

عبدالوہاب فندن

بحرِ ہند میں ستارۂ ہند (Indian Star in indian ocean) کے لقب سے مشہور جزیرۂ ماریشس برصغیر سے کافی دور ایک ایسی آبادی ہے جو بیشتر ہند نژاد باشندوں پر مشتمل ہے۔ دراصل انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی نوآبادکاروں نے اپنے زیرنگیں ملک کے باشندوں کو کچھ غیر آباد جزیروں میں کاشتکاری خصوصاً گنّے کی کاشت اور فیکٹریوں میں مزدوروں کی ضرورت کی غرض سے منتقل کرنا شروع کیا۔ ایسے جزیروں میں تین مختلف سمتوں میں واقع تین جزیرے اہم ہیں، جہاں بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو لاکر بسایا گیا، ایک بالکل جنوب میں جزیرہ ماریشس دوسرا انتہائی مشرق میں جزیرہ فجی اور تیسرا دنیا کے مغربی حصہ میں واقع جزیرہ ٹرینیڈاڈ اور ٹوبیگو۔ ان جزیروں میں ہندوستانی باشندے اپنے ساتھ تہذیب و ثقافت، مذہب اور زبان کو بھی لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ماریشس میں انگریزی اور فرانسیسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دیگر زبانیں بھی بولی سمجھی اور پڑھی جاتی ہیں جن میں سب سے اہم بھوجپوری اور اردو زبانیں ہیں۔

ماریشس کے تمام چھوٹے بڑے سرکاری اسکولوں، نجی اداروں اور مکتبوں و مدرسوں میں اردو پڑھانے کا معقول انتظام ہے۔ اعلیٰ سطح پر مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ (MGI) میں بھوجپوری، ہندی، تمل، تلگو، بنگالی اور مراٹھی کے ساتھ ساتھ اردو کا شعبہ بھی قائم ہے۔ جس کے موجودہ صدر

ناب صابر گوڈر ہیں۔ حال ہی میں جناب قاسم ہیرا اور عنایت حسین عیدن سبکدوش ہو چکے ہیں،
برصغیر سے ہزاروں میل دور براعظم افریقہ کے ایک جزیرہ میں اردو کو قائم اور باقی رکھنے میں کچھ
لوگوں نے یقیناً بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایسے لوگوں میں جناب عبدالوہاب فندن کا نام سرفہرست
ہے۔

عبدالوہاب فندن کی پیدائش ماریشس کے ضلع فلاک میں ۲۰/ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ہوئی۔ ان کے والد
کا نام دین محمد اور والدہ کا نصیبا تھا۔ دادا فندن ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ سے
انیسویں صدی کے نصف آخر میں ماریشس آئے۔ جنہیں فلاک کے شوگر اسٹیٹ میں بھیج دیا گیا۔
کچھ عرصہ بعد وہ فور مین کے عہد پر پہنچ گئے ۔ یہ بات قابل غور ہے کہ فندن فیملی کے تعلقات
ہندوستانی رشتہ داروں سے ۱۹۲۵ء تک قائم رہے اس کے بعد یہ تعلقات منطقع ہو گئے۔

عبدلوہاب فندن سب سے پہلے Bon Accueli R.C اسکول میں داخل کئے گئے اس
کے بعد ۱۹۲۳ء میں Reetoo School میں تعلیمی سلسلے کو جاری رکھا کیوں کہ فندن صاحب کو
معلمی کے پیشہ سے دلچسپی تھی اس لئے ۱۹۲۸ء میں تدریسی ٹرنیگ کورس (Monitor's Exam)
کو پاس کرنے کے بعد فروری ۱۹۲۹ء میں St. Julien اسکول میں ان کا تقرر ہوا۔

St.Julien اسکول سے عبدالوہاب فندن نے اپنے کیریئر کی ابتدا کی اس کے بعد ترقی کر
کے Bon Accueil اسکول، پھر Queen Victoria اور Riviere Seche اسکول
میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1942ء میں آپ نے انٹرمیڈیٹ اور 1944ء میں لندن
یونیورسٹی سے (فرنچ، اردو، ہندی) بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ گریجویشن کرنے کے بعد گورنمنٹ
سیکنڈری اسکول میں نوکری کے لئے درخواست دی لیکن یہ درخواست مسترد کر دی گئی کیونکہ یونانی
زبان کا جاننا ضروری تھا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اسوقت کسی انڈو ماریشس نسل کے آدمی کا
گورنمنٹ سکنڈری اسکول میں ملازمت کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ فندن صاحب نے اب کبھی
درخواست نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۶۳ء میں ۵۲ سال کی عمر میں آپ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

عبدالوہاب فندن کو مشرقی زبانوں سے والہانہ محبت تھی چنانچہ انگریزی، فرنچ، لاطینی زبانوں

کے ساتھ ساتھ اردو، ہندی زبانوں کو بھی سیکھا حالانکہ ہندوستان کا سفر نہیں کیا۔ آپ نے ہندی زبان اپنے بچپن کے استاد دواسو وشنو دیال سے جبکہ اردو ایک مدرسہ میں سیکھی۔

عبدالوہاب فندن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جامعہ اردو علی گڑھ کی شاخ ماریشس میں قائم کی۔ اس کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ نومبر ۱۹۵۶ء کی بات ہے فندن صاحب کو ماریشس کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کی جانب سے ایک خط موصول ہوا جس میں کہا گیا کہ ٹیچرس ٹرینگ کالج میں ہندی اور اردو کی خالی اسامیوں کے انٹرویو کے لئے سیلکشن کمیٹی کا ممبر آپ کو بنایا جارہا ہے۔ آپ اس سلسلے میں حکومت کا تعاون کریں۔ انٹرویو کے دن انہیں احساس ہوا کہ ہندی کے بیس جگہوں کے لئے دو امیدوار موجود ہیں جن کے پاس ہندی کے سرٹیفکٹ موجود ہیں جب کہ اردو کی چھ جگہوں کے لئے صرف چھ امیدوار ہیں جن کے پاس کوئی سرٹیفکٹ نہیں ہے بہر حال ہندی کے بیس طلبہ اور اردو کے لئے بڑی مشکل سے تین طلبہ کو منتخب کیا گیا۔

اس واقعہ نے انہیں بڑا متاثر کیا اور ذہن کو جھنجھوڑا کہ ماریشس میں اردو کا کوئی امتحان نہیں ہوتا۔ کافی غور وفکر کے بعد انہوں نے AMU کے ریکٹر کو خط لکھا کہ کیا آپ ہندوستان سے باہر ماریشس میں بھی اردو کے امتحان کرانے کی کوئی شکل نکال سکتے ہیں۔ انہیں ریکٹر کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ البتہ دو ماہ بعد جامع اردو کے رجسٹرار جناب ظہیر الدین علوی کا خط ملا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریکٹر (Reactor) نے آپ کے خط اور پروگرام سے باخبر کیا ہے۔ اس تعلق سے عرض یہ ہے کہ جامع اردو علی گڑھ نے ابھی تک بیرون ملک میں امتحانات نہیں کرائے ہیں۔ ہاں، یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ کم سے کم پچیس طلبہ کی تعداد موجود ہو تو ماریشس میں امتحان کرائے جاسکتے ہیں۔ عبدالوہاب فندن صاحب کے لئے یہ ایک بڑی خوش خبری تھی چنانچہ آناً فاناً فندن صاحب نے مقامی اخبارات میں اس امتحان کے لئے اشتہار دیدیا۔

جلد ہی فندن صاحب کو چالیس درخواستیں وصول ہوئیں۔ ان تمام کو اپنے خرچ سے انہوں نے ہندوستان بھیجا۔ رجسٹرار ظہیر الدین علوی نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اسی سال اکتوبر ۱۹۵۷ء میں پہلی دفعہ بیرون ملک ماریشس میں جامعہ اردو علی گڑھ نے ''ابتدائی'' کے امتحانات

کرائے جس میں 24 لڑکے اور ایک لڑکی کامیاب ہوئے۔ چار برسوں کے اندر 1941ء تک چاروں کورس ابتدائی، ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل کا تعارف ہوگیا اس کے بعد ہر سال چاروں امتحانات پابندی سے ہونے لگے اور سال بہ سال طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں طلبہ کی کل تعداد ۸۹۸ تھی جس میں ۳۹۸ لڑکے اور ۵۰۰ لڑکیاں تھیں۔ ۱۹۸۷ء تک ان تیس '۳۰' سالوں کے عرصہ میں امیدواروں کی کل تعداد ۶۱۶، ۸ تھی جس میں ۱۱۷، ۶ امیدوار کامیاب ہوئے۔ ماریشس میں جامعہ اردو کے کامیاب امتحان کرانے کے بعد عبدالوہاب فندن کے سامنے اگلا مرحلہ حکومت سے منظور کرانے کا تھا۔ یہ مسلہ بھی ان کے قریبی دوست جناب یوسف رمضان نے حل کر دیا جو اس وقت ماریشس کے محکمہ تعلیم وثقافتی معاملات (Ministry of Education (and Cultural Affairs کے پارلیمنٹری سکریٹری تھے۔ صحت کی خرابی کی بناء پر فندن صاحب نے جامع اردو علی گڑھ سے ۱۹۸۵ء میں نگرانی سے معذرت کرلی۔ اس کے بعد نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ'' کو یہ ذمہ داری سونپی گئی جس کے سربراہ عنایت حسین عیدن تھے، بلکہ اب بھی ہیں۔

اس طرح تقریباً تیس سال کے لمبے عرصے تک عبدالوہاب فندن بحسن وخوبی جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کراتے رہے۔ طلبہ کی مزید حوصلہ افزائی کی خاطر مختلف پروگرام اپنے خرچ سے کرتے اور طلبہ کو انعامات سے بھی نوازتے رہے۔ اردو کا یہ اتنا بڑا خادم حیرت ہے کہ ہندو پاک کا ایک سفر بھی نہیں کیا اور اپنے ملک میں اردو داں طبقہ کے لئے روشن مستقبل کے لئے دروازہ کھول گیا۔

(ادبی مجلّہ ''ہماری آواز'' میرٹھ' جنوری تا جون ۲۰۰۶ء)

اردو طباعت واشاعت میں دیوبند کا حصہ

دیوبند کا نام سنتے ہی ذہن دارالعلوم کی طرف منتقل ہوتا ہے۔اس لیے کہ دیوبند کو شہرت اس عظیم اسلامی دانش گاہ کی وجہ سے ملی ہے جو برصغیر ہندو پاک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اپنی قومی، ملکی، ملی، مذہبی اور علمی خدمات کی بنا پر مشہور و ممتاز ہے۔اس نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ ہمہ جہت تاریخ میں انگریزوں کا جبر و استبداد دیکھا۔ پھر ملک کی آزادی دیکھی، نہیں! بلکہ اس کے ارباب حل وعقد نے آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اس کے بعد تقسیم وطن کا مسئلہ سامنے آیا تو اس کے خلاف بھی محاذ آرائی کی۔لیکن سیاسی بازی گروں کے سامنے شکست سے دوچار ہونا پڑا جو کہ ہندستان کی سیاسی تاریخ کا المیہ ہے۔ بہر حال ملک آزاد ہوا تو قربانیوں کا صلہ پانے والوں کی بھیڑ سے انھوں نے خاموشی کے ساتھ اپنے کو الگ کر لیا اور پھر! جمہوری ملک میں اقتدار کی لڑائی، حکومتوں کے عروج و زوال، درباری لوگوں کی اس دربارِ فقیری میں حاضری اور اب خوفناک دوری، دہشت گردی کی اصطلاح اور اس کے دہشت خیز اب دہشت گردوں کی زبان اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے کھوکھلے نعرے لگانے کے بجائے دارالعلوم نے عملی طور اپنا کر فروغ بخشا۔ زندہ رکھا اور اس کی لنگوا فرینکا کی حیثیت کو استحکام عطا کیا۔ چنانچہ اردو طباعت میں بھی بلواسطہ اور بلا واسطہ اس ادارے کا بڑا اہم حصہ ہے۔

اردو طباعت و اشاعت کے میدان میں دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، ملک کی مختلف اردو اکادمیاں، NCPUL , NBT مکتبہ جامعہ لمیٹڈ و دیگر درجنوں پبلیشرز و غیر محتاج تعارف نہیں

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دیو بند کا بھی اس میدان میں کوئی حصہ ہے۔ جی ہاں! حصہ ہی نہیں، بلکہ اس کی پہچان ہے وہ کیا؟ آپ کو حیرت ہوگی کہ اردو کی کتابیں آپ کو پوری دنیا میں دیو بند سے زیادہ سستی اور مناسب قیمت پر کہیں دستیاب نہیں ہوں گی۔ اردو طباعت واشاعت کی دنیا میں یہ کیا بڑی پہچان نہیں ہے......! آخر اردو کتابوں کے اتنے ارزاں ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں عالمی شہرت یافتہ شاعر اور نواز پبلی کیشنز کے مالک ڈاکٹر نواز دیو بندی کا کہنا ہے:

> ''چونکہ دارالعلوم کو عالمگیر شہرت حاصل ہے اور دارالعلوم کا بنیادی مقصد تبلیغ دین اور اشاعت دین ہی ہے۔ لہٰذا تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ دیو بند میں طباعت واشاعت کا کام بھی شروع ہو گیا۔ اس میں مزید ترقی ہوتی گئی اور اشاعت کا دائرہ بڑھتا ہی گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سو سے زائد اشاعتی و تجارتی کتب خانے اور بیس سے زائد صباعتی مشینیں ہیں۔ ''انھوں نے مزید کہا کہ'' جن لوگوں نے یہ کام شروع کیا ان کا مقصد خدمت تھا۔ اب خدمت کے ساتھ ساتھ کاروبار بھی شروع ہو گیا۔ لیکن آج بھی خدمت کا جذبہ بحال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں ہر جگہ سے کم قیمت پر یہاں کتابیں دستیاب ہیں۔''

اردو طباعت واشاعت میں دیو بند کی جو اہمیت ہے اس کی وجہ میں نے دارالکتاب کے مالک مولانا ندیم الواجدی سے دریافت کی تو انھوں نے اس کی تین وجہ بتائیں۔ اول دارالعلوم اور پورے ملک میں پھیلا مدارس کا نیٹ ورک، دوسرے معیار، تیسرے قیمتوں میں کمی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں کسی شہر کے مقابلے دیو بند کا نکاس بہت زیادہ ہے۔ عظیم بک ڈپو کے مالک جناب عبد اللہ راہی کا خیال ہے کہ تقریباً سوا لاکھ روپے کی قیمت کی کتابیں روزانہ دیو بند سے فروخت ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر نواز دیو بندی نے بتایا کہ دنیا کے جس حصے میں بھی اردو پڑھی اور بولی جاتی ہیں یہ کتابیں وہاں تک جاتی ہیں اور اس کا بہترین ذریعہ طلبہ ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں سے ہزاروں کی تعداد میں یہاں پڑھنے آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر دنیا کے کسی خطے میں ایک کتاب بھی پہنچ جائے تو اندھیری رات میں جگنو کا کام کرتی ہے اور اب تو اشتہار کی دنیا ہے۔ اخبار سے، رسائل سے

،انٹرنیٹ سے دیوبند بھی جڑا ہوا ہے اور چونکہ دیوبند کو مرکزیت حاصل ہے اس لیے جب کسی شخص کو دینی موضوع پر کتاب کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ براہ راست دیوبند سے ہی رابطہ کرتا ہے۔ خواہ کتاب کہیں کی چھپی ہو۔حتیٰ کہ دہلی کی بھی۔

مکتبہ تھانوی کے ذمے دار جناب وقار احمد نے کہا کہ ان کی کتابیں بنگلہ دیش، جنوبی افریقہ، انگلینڈ اور مورشس وغیرہ ایکسپورٹ ہوتی ہیں۔ کتابوں کی اتنی زبردست نکاسی کے بارے میں جناب ندیم الواجدی نے مولانا علی میاں کی کتابوں کی مثال دی کہ مولانا کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ پھر بھی ان کتابوں کا یہ حال ہے کہ کئی سال بلکہ دہے گزر جاتے ہیں دوبارہ اشاعت نہیں ہو پاتی اور یہاں یہ حال ہے کہ بعض کتابیں چھ مہینے بھی نہیں گزرتے کہ دوسرا اڈیشن بازار میں آجاتا ہے، جبکہ ناشرین متعدد ہیں۔

موضوعات کے بارے میں جب دارالاشاعت کے مالک مولانا صدرالزماں سے میں نے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ درس نظامی کی کتابیں اور ان کی شروحات زیادہ چھپی ہیں۔ اس کے علاوہ سوانح، سیرت، اخلاق، تصوف، تاریخ، فقہ، حدیث، تفسیر، سفرنامے اور خطبات وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ ان میں بعض کتابیں چھ ہزار صفحات اور کئی جلدوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ادبی کتابوں کے شائع کرنے کا رجحان ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ ندیم الواجدی صاحب سے میں نے اس سلسلے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ اگر یونیورسٹی اور کالج کے حضرات متوجہ ہوں تو یقیناً ان کی کتابیں بھی بہتر معیار اور کم قیمت پر طبع کرنے کو ہم تیار ہیں۔ نواز دیوبندی نے کچھ ادبی کتابیں شائع کی ہیں ان میں خود ان کا مجموعہ کلام ''پہلا آسمان'' مولانا محمد حسین آزاد کی کلیات قابل ذکر ہیں۔ یہ کلیات انھوں نے پہلی دفعہ شائع کیا ہے۔

دیوبند میں اردو طباعت واشاعت کا آغاز کیسے ہوا؟ اس سلسلے میں جناب عبداللہ راہی نے بتایا کہ دارالعلوم کو جب درسی کتابوں کی ضرورت پڑتی تو وہ دہلی کے کتب خانہ رشیدیہ اور لکھنؤ کے نول کشور پریس سے کتابیں فراہم کرتا۔ آگے چل کر دیوبند میں ہی محمد علی صاحب نے ''کتب خانہ امدادیہ' مولانا سید احمد نے کتب خانہ اعزازیہ اور مولانا اسحاق نے کتب خانہ رحیمہ قائم کیا۔ اس کے

بعد راشد اینڈ کمپنی اور مکتبہ تجلی قائم ہوئے اور اب صورت حالی یہ ہے سو سے زائد مکتبے موجود ہیں۔
اسی طرح طباعت کے لیے سب سے پہلے مولانا شوکت خاں نے نیشنل پریس، شوکت ہاشمی نے محمدی پریس اور مولانا افضال نے محبوب پریس قائم کیے۔ اس وقت اکثر مکتبہ والوں نے اپنا پریس بھی رکھ لیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق بیس سے زائد جدید طرز کی آفسٹ مشینیں دن رات کتابیں چھاپ رہی ہیں۔

طباعت کے مراحل میں آنے والی دشواریوں کے بارے میں محبوب پریس کے مالک جناب قاضی انوار سے میں نے دریافت کیا تو ان کا کہنا تھا کہ دشواری بالکل نہیں ہے۔ البتہ چہار رنگی ٹائٹل کے لیے دہلی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ پہلے فلمیں بنانے کا مسئلہ تھا، وہ اب قابو میں آچکا ہے۔ جلد سازی معیاری ہوگئی ہے۔ ہاتھ سے کتابت کے وقت پریشانیوں کا سامنا تھا۔ اب تو کمپیوٹر سے اشاعی وطباعتی دنیا میں انقلاب آگیا ہے۔ ہر کام میں تیزی آگئی ہے۔ چنانچہ طباعت واشاعت کے تمام مراحل میں دیو بند خود کفیل ہوگیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے ہر مہینے ہزاروں کتابیں چھپتی اور فروخت ہوتی ہیں۔ قابل ذکر پریس میں محبوب پریس، فیصل پریس، مختار پریس، یاسر پریس تھانوی پریس اور یونین پریس ہیں۔

دیو بند کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ یہاں ہر گلی میں مسجد اور مولوی نظر آئیں گے لیکن اضافہ اس کے ساتھ اور ہوگیا ہے' وہ ہے کمپیوٹر سنٹر کا۔ بلاشبہ اس وقت دیو بند کی گلیوں میں سیکڑوں کمپیوٹر ہیں جو رات دن کمپوزنگ کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ٹریننگ بھی دیتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اردو کتابوں کی کمپوزنگ واجبی قیمت پر ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیو بند میں اردو کتابوں کی طباعت واشاعت کے امکانات روشن ہیں۔ البتہ میری نگاہ میں یہاں کے ناشرین میں ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ ان میں اتحاد واتفاق کی کمی ہے، جس کے نقصانات کو وہ بلاشبہ محسوس کرتے ہیں۔ اگر یہ مسئلہ یوں ہی بنا رہا تو اردو طباعت اشاعت میں دیو بند کا جو حصہ ہے وہ متاثر ہوسکتا ہے۔

(ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، مہمان مدیر، مئی ۲۰۰۶ء)

انقلاب 1857ء غالبؔ کی نظر میں

1857ء کے واقعہ کو میں نے محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے لفظ ''انقلاب'' سے موسوم کیا ہے۔ حالانکہ اسے غدر، فوجی بغاوت اور جنگِ آزادی کی پہلی کوشش بھی کہا جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ 1857ء کے بعد ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تعلیمی، مذہبی، ادبی اور ذہنی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور بہت ہی کم وقت میں زندگی کے تمام شعبوں میں اتنے گہرے اثرات کے ڈانڈے کسی اور واقعہ سے نہیں ملتے۔ اس کے اسباب تلاش کرنا بے محل ہے۔ البتہ مرزا غالبؔ کی نظر میں یہ واقعہ کس نوعیت کا ہے اسے جاننے سے پہلے غدر پہلی جنگِ آزادی یا انقلاب کی گتھی سلجھانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس بات میں مورخین کا اختلاف ہے۔ مالی سن (Malleson) ٹرویلین، لارنس، سرسید احمد خاں، منشی جیون لال اور معین الدین وغیرہ نے اس واقعہ کو غدر کہا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام فوج نے اس میں حصہ نہیں لیا تھا اور نہ ہی یہ لڑائی فوج کی بغاوت تک محدود تھی۔ ہاں اس کا آغاز فوجی بغاوت سے ہوتا ہے۔ ہم عصر برطانوی کنزرویٹو پارٹی کے اہم لیڈر بنجامن ڈزریلی نے اسے ''فوجی بغاوت'' کہا ہے۔[1] حالانکہ بیسویں صدی میں آزادی کی عوامی تحریک شروع ہونے سے قبل قوم اور وطن کا تصور ہندوستانیوں کے لیے غیر اہم اور غیر واضح تھا۔ ڈاکٹر ایس بی چودھری، این این سین اور آر سی مجمدار وغیرہ اسے آزادی کی پہلی لڑائی کہتے ہیں۔[2] 1957ء میں ہندوستانیوں نے یہ صدی جس دھوم دھام سے منائی اور اب 2007ء میں اس کی ڈیڑھ سو سالہ تقاریب منانے

کی جو تیاریاں چل رہی ہیں اس سے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ آزادی کی پہلی لڑائی تھی۔

میرے خیال میں یہ انگریزی پالیسیوں کے خلاف صرف ایک ردِ عمل تھا البتہ اس کے نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ انگریزی حکومت کی پالیسیوں سے جن کے مفاد ٹکرار ہے تھے انہوں نے ہی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان میں تین طبقے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ فوج، مذہبی رہنما اور معزول ریاستی حکمراں، تعلقہ دار اور زمیندار وغیرہ۔ فوج نے جو حصہ لیا اس کی وجہ کچھ بھی ہو چاہے گائے یا سور کی چربی کی ملاوٹ سے بنے کارتوس یا کچھ اور لیکن اس سے پہلے بھی فوج نے کئی مرتبہ بغاوت کی تھی۔ دوسرا بڑا طبقہ وہ ہے جن کی ریاستوں کو انگریزوں نے ختم کر دیا یا اختیارات کو محدود کر دیا تھا۔ اس طبقہ نے لڑائی میں قائدانہ کردار ادا کیا ایسے لوگوں میں اودھ کی بیگم حضرت محل، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، مراٹھا لیڈر نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے، بریلی کے خان بہادر خان اور جگدیش پور کے زمیندار کنور سنگھ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ تیسرا طبقہ مذہبی رہنما خصوصاً مسلم علماء کا تھا۔ پچھلے تمام حملہ آوروں اور انگریزوں میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ موخر الذکر نے عیسائیت کی تبلیغ کی حکومتی سطح پر سرپرستی کی۔ انیسویں صدی میں تربیت یافتہ عیسائی مشنریوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ کمپنی کے صدر مسٹر مینگلس (Mr . Mangles) کی اس بات سے اندازہ لگایئے کہ جب انہوں نے دارالعوام (House of Commone) میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''قدرت کی مہربانی سے ہندوستان جیسا عظیم ملک برطانیہ کو ملا ہے تا کہ عیسائی مذہب کا پرچم ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک لہرا سکے۔ ہر شخص کو جلد از جلد تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں اپنی تمام طاقت صرف کر دینی چاہئے۔'' [۳]

یہی وجہ ہے کہ مذہبی رہنماؤں خصوصاً مسلم علماء نے 1857ء کے انقلاب میں عملی طور پر حصہ لیا۔ تفصیل کے لئے ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب Our Indian Mussalmans کو دیکھ سکتے ہیں۔ اب آیئے غالب کو دیکھیں کہ ان کی نظر میں انقلاب 1857ء کی کیا اہمیت ہے۔

مرزا غالب انقلاب کے وقت دہلی میں ہی قیام پذیر تھے۔ 11 مئی 1857 سے 31 جولائی

1857ء تک کے حالات انہوں نے اپنی فارسی کتاب ''دستنبو'' میں تحریر کئے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے خطوط میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔مگر دستنبو اور خطوط میں اس واقعہ کے تعلق سے ان کے نظریہ میں تضاد نظر آتا ہے۔ دستنبو میں انگریزوں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے تو خطوط میں وطن و ہم وطنوں پر گزری آزمائش سے پریشان دکھائی دیتے ہیں۔انقلاب کی تاریخ غالبؔ نے ''رستخیز بے جا'' سے نکالی ہے۔ یہ اس بات کی غماز ہے کہ غالبؔ اسے بجا کہنے کو تیار نہیں ہیں۔شاید غالب کے ذہن میں یہ بات ضرور رہی ہوگی کہ جلد ہی اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں منتقل ہوجائے گا اور اب ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے وظیفہ خوار ہونے کے بجائے ملکہ وکٹوریہ کے ''کوئن پوئٹ'' بننے کا راستہ زیادہ آسان اور بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب سے دو سال پہلے ہی 1855ء میں غالب نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ایک طویل فارسی قصیدہ لکھ کر بھیجا۔انقلاب کے بعد انگریزوں نے جب دوبارہ دہلی پر قبضہ کیا تو ایک بار پھر ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں غالبؔ نے فارسی قصیدہ لکھا۔لیکن اس پر بھی غالبؔ کے ''کوئن پوئٹ'' بننے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور پنشن کا اجرا بھی التوا میں پڑ گیا تو بالکل جانبداری سے کام لیتے ہوئے 1857ء کے واقعات کو قلمبند کیا اس کا نام انہوں نے ''دستنبو'' رکھا۔

ظاہر ہے یہ بھی ''حاکمان عال'' اور ''شیر دل فاتحین'' کی تعریف کا ایک پلندا ہے چنانچہ ایک خط میں اپنے ارادے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''......(اس کے شائع ہونے پر) ایک جلد گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی۔'' ؎

غالب نے یہ جملہ کہ ''اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی'' واقعی بڑا معنی خیز لکھا۔

اب آپ بھی سمجھیے کہ غالبؔ نے یہ کیوں لکھا۔ پوری کتاب میں جگہ جگہ انقلاب میں حصہ لینے والے ہم وطنوں اور انگریزوں کو ایسے ایسے خطابات غالب نے دیے ہیں کہ شاید ہی کسی اور ہندوستانی نے یہ کام کیا ہو۔

ہندوستانیوں کو نمک حرام، سیاہ باطن، گمراہ باغی، سیہ کار رہزن اور خبیث آوارہ جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے جبکہ انگریزوں کو حاکمان عادل، پیکر علم و حکمت، خوش اخلاق و نیک نام حاکم اور شیر دل فاتحین جیسے خطابات دیے ہیں۔ ۵ بہادر شاہ ظفر جس کے وہ وظیفہ خوار تھے پوری کتاب میں ان کا نام ہی نہیں لیا۔ اپنے گہرے دوستوں مثلاً صدرالدین آزردہ اور فضل حق خیر آبادی کے ذکر سے بھی گریز کیا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ریاستی حکمرانوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے مگر 1857ء کے واقعہ کے ذمہ داری سے انہیں بری کر دیا ہے۔ موجودہ دور کے ایک اہم نقاد نے اس واقعہ کے تناظر میں غالب کو "واقعیت پرست" اور ہوش مند" کہا ہے جبکہ "موقع پرست" کہنا شاید زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ چند مہینہ کے لیے دہلی جب انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تو جیون لال کے روز نامچے کے مطابق غالب دوبارہ دربار سے وابستہ ہو گئے اور آگرہ میں انگریزوں کی شکست کھا جانے پر قلعہ میں قصائد پڑھ کر سنائے۔ منفعت کے کسی موقعہ کو غالب گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ انقلاب سے پہلے غالب کا انگریزوں کا طرفدار رہنا، انقلاب کے دوران قلعہ والوں سے تعلق بنائے رکھنا اور فتح دہلی کے بعد دوبارہ "شیر دل فاتحین" انگریزوں کے گن گانا غالب کی موقعہ پرستی کا پتہ دیتے ہیں ۔ البتہ بعض جگہوں پر غیر ضروری خودداری کا نمونہ بھی پیش کرتے ہیں مثلاً 1842ء میں دہلی کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے تقرری کے لیے انہیں مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند کے مکان پر مدعو کیا گیا تو وہاں سے الٹے پاؤں اس لیے واپس ہو گئے کہ مسٹر ٹامسن ان کے استقبال کے لیے دروازے تک نہیں آئے۔ ۶

قصائد لکھنے کے باوجود تھوڑے وقت کے لیے جو مرزا غالب کی شامت آئی تو وہ انگریزوں کے ہاتھ چڑھ گئے۔ کیوں کہ انقلاب کے دوران ان کا قلعہ سے تعلق ہو گیا تھا۔ کچھ انگریز انہیں گھر سے نکال کر دہلی کے ملٹری گورنر کرنل برن کے پاس لے گئے جو مرزا غالب کے مکان کے قریب ہی مقیم تھا۔ مرزا غالب اور کرنل برن کے درمیان جو گفتگو ہوئی اسے حالی نے اس طرح بیان کیا ہے:

"انہوں نے (کرنل برن) مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ وِل تم مسلمان؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنل یہ سن کر ہنسنے لگا۔ پھر مرزا نے وزیر

ہند کی چٹھی' جو ملکہ وکٹوریہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں
آئی تھی دکھائی' کرنل نے کہا تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ
حاضر ہوئے۔

مرزا نے کہا " میں چار کہاروں کا افسر تھا وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ
گئے۔ میں کیوں کر حاضر ہوتا؟ کرنل نے نہایت مہربانی سے مرزا
اور ان کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔" ے

اب ہم غالب کے خطوط پر نظر ڈالتے ہیں کہ انقلاب کے تعلق سے ان کے کیا تاثرات ہیں؟
اپنے خطوط میں غالب نے انقلاب کا تذکرہ کثرت سے کیا ہے لیکن یہاں رویہ بدلا ہوا ہے۔ اس
میں وہ غالب نہیں ہیں جو دستنبو میں نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اتنا بڑا
شاعر غالبؔ اپنے دیوان میں اسے جگہ دینے کے لیے کیوں نہیں تیار ہے۔ نہ تو شہر آشوب لکھا اور نہ ہی
کوئی طویل نظم۔ بڑی مشکل سے دس اشعار انہوں نے انقلاب کی نذر کیے جو خطوط میں ملتے ہیں اس
کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں غالب نے اپنی تحریروں میں انقلاب 1857ء
کا تذکرہ کثرت سے کیا ہے۔ انقلاب کے بعد کا جو ماحول تھا اُن میں چار حالتوں کا ذکر تفصیل سے
کیا ہے۔ دہلی و مضافات کی بربادی کا ذکر' دوستوں واحباب کے بچھڑنے کا غم' مہنگائی کا تذکرہ اور
اپنی پنشن کی پریشانی' طوالت کے خوف سے میں چند بہت ہی ضروری مثالیں پیش کرتا ہوں۔

23 مئی 1861ء کو میر مہدی مجروح کو ایک خط لکھتے ہیں:

"ایک آزردہ سو خاموش' دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش' نہ سخنوری
رہی' نہ سخندانی کی۔ برتے پر تاپانی؟ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں
جائے دلّی۔"

دسمبر 1859ء میں مجروح کو ہی دلی کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی' قلعہ' چاندنی چوک ہر روز مجمع جامع
مسجد کا' ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی' ہر سال میلہ پھول والوں کا' یہ
پانچوں باتیں اب نہیں پر کہو دلّی کہاں؟ ہاں' کوئی شہر قلمرو ہند میں اس
نام کا تھا۔"

انقلاب 1857ء کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے وہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا کہ الامان الحفیظ' اس موقعہ پر غالبؔ کے متعدد دوست واحباب کو نشانہ بنایا گیا۔ امام بخش صہبائی کو جمنا کے کنارے لے جا کر شہید کر دیا گیا۔ صدر الدین آزردہ نے اس پر تڑپ کر کہا تھا۔

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مولوی محمد باقر کو بھی شہید کیا گیا۔ فضل حق خیر آبادی کو انڈمان کی سزا ہوئی مفتی صدر الدین آزردہ کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا اور جائیداد بھی ضبط کر لی گئی۔ ان تمام کا تذکرہ غالبؔ نے خطوط میں کیا ہے۔

میاں داد خاں سیاح کو 14 اکتوبر 1862ء میں لکھتے ہیں۔

''ہاں خاں صاحب! اب جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے میں اس کا کیا حال ہے۔''

احمد حسن مودودی کو 19 جنوری 1862ء میں لکھتے ہیں:

''صدر الدین صاحب (آزردہ) بہت دن حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا...... نوکری موقوف جائیداد ضبط''

غلام نجف خاں کو اپریل 1857ء میں لکھتے ہیں:

''اس فتنہ و آشوب میں تو کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں بہت عزیز ہیں۔ واللہ! دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔''

غالبؔ اپنے خطوط میں انقلاب کے بعد کی گرانی کا ذکر کرتے ہوئے چودھری عبدالغفور کو ستمبر 1860ء میں لکھتے ہیں:

''غلہ گراں ہے' موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے ماش کی دال آٹھ سیر' باجرہ سولہ سیر' گیہوں تیرہ سیر' چنے سولہ سیر' گھی

ڈیڑھ سیر ترکاری مہنگی۔''

شیو نرائن آرام کو 1858ء میں لکھتے ہیں:

''مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں، بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔''

اپنی پنشن کا ذکر بھی مرزا نے بار بار کیا ہے۔ تفتہ کو 21 جنوری 1857ء میں لکھتے ہیں:

''مئی 1857ء سے پنشن نہیں پایا ہے، کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے؟ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔''

غلام نجف خاں کو 1857ء میں لکھتے ہیں:

''پنشن اگرچہ ملے گا، لیکن دیکھیے کب ملے گا؟ اس کے ملنے تک کیا ہوگا اور اس ملنے سے میرا کیا کام نکلے گا؟ قطع نظر ان امور سے اس وجہ قلیل کو کس بستی میں بیٹھ کر کھاؤں گا؟ یہ شہر اب شہر نہیں، قہر ہے۔''

ان خطوط سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انقلاب کے بعد جو صورت حال تھی اس کا سچے دل سے غالبؔ نے ذکر کر دیا ہے لیکن یہ صرف ایک انسانی تاثرات ہیں جسے ہر حساس دل محفلوں یا خطوط کے ذریعہ بیان کر دیتا ہے۔ لیکن انقلاب کے تعلق سے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے تئیں ان کا کیا رویہ رہا یہ سوال بتانے سے خطوط قاصر ہیں۔ چلئے دستنبو ایک خاص مقصد کے تحت لکھی گئی لیکن انقلاب کے تعلق سے غالب کے رویہ پر ان کا دیوان بھی خاموش ہے اور یہ اتنی غیر معمولی بات تھی کہ خود غالب کی زندگی میں اس پر سوال اٹھنے لگے تھے۔

غالبؔ نے انقلاب کے تعلق سے دس شعر کہے ہیں ایک شعر میر مہدی مجروح کے نام 2 فروری 1859ء کے خط میں لکھا تھا وہ یہ ہے۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

ایک خط علائی کے نام 1857ء میں لکھا تھا اس میں نو شعر ملتے ہیں جس کے چند شعر یہ ہیں۔

چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں کا آدمی واں نہ جاسکے، یاں کا
اس طرح کے وصال سے، یارب کیا مٹے دل سے داغ، ہجراں کا

1857ء کے بعد غالبؔ کی زندگی میں ان کا اردو دیوان متعدد بار شائع ہوا مگر ان اشعار کو جگہ نہیں دی گئی۔ ان کے انتقال کے فوراً بعد مارچ 1869ء میں اردوئے معلیٰ کے ذریعہ ہمیں اس کی اطلاع ملی۔ دراصل غالب کا یہ رویہ جدوجہد آزادی یا انقلاب میں کسی گہری دلچسپی کو ظاہر نہیں کرتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس صدمہ کی وجہ سے شاید غالب کی شعر گوئی کی قوت جاتی رہی اور اس انقلاب نے شاعر زیست غالبؔ کو چھین کر نثر نگار غالبؔ سے روشناس کرایا اور ان کا تمام نثری سرمایہ چاہے فارسی ہو یا اردو انقلاب ہی کی دین ہے۔

حواشی:

۱۔ S.B Choudhary
The theories of Indian Mutiny, 1857,p.173

۲۔ Joshi
Eighteen Fifty Seven, p. 417

۳۔ B.L. Grover : History of Modern India
(New Delhi : S Chand & Com . Ltd. 1988)

۴۔ اردوئے معلیٰ لاہور 1922ء ص 41

۵۔ دیکھئے دستنبو ص 13 سے 57 تک

۶۔ یادگار غالب: حالی (غالب انسٹی ٹیوٹ: نئی دہلی 1966) ص 29

۷۔ یادگار غالب: حالی انسٹی ٹیوٹ: نئی دہلی 1966) ص 40

(27 دسمبر 2006ء کو مانو حیدرآباد میں بین الاقوامی سیمینار میں پڑھا گیا مقالہ)

تحریک ریشمی رومال اور اردو

۱۸۵۷ء کی جدو جہد آزادی کو کچلنے کے بعد جب انگریزوں کے ذریعہ ڈھائے گئے ظلم وستم اور جبر و بربریت کا طوفان تھما تو کچھ عرصہ تک ایک ہو کا عالم تھا۔ لیکن یہ سناٹا بھی رفتہ رفتہ اصلاحی، تجدیدی اور تعلیمی تحریکات کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر جدو جہد آزادی کی مختلف تحریکات میں تبدیل ہونے لگا۔ اس غیر ملکی تسلط کے خلاف مزاحمت ملک کے تقریباً ہر طبقہ کی جانب سے ہونے لگی، علماء ومشائخ کا طبقہ تو ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز کی للکار کے بعد ہی درس گاہوں و خانقاہوں سے نکل کر آزادی کی روح پھونکنے کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکا تھا۔ یہاں تک ۱۸۳۰ء میں بالاکوٹ کی پہاڑیوں پر سید احمد شہید کے زیر قیادت مولانا اسمٰعیل شہید سمیت ہزاروں علماء نے شہادت کا جام پیا تو ان حضرات کی قربانیوں کے نتیجہ میں ملک کے طول وعرض میں بسنے والے اکثر ہندوستانیوں کے سینوں میں آزادی کا جذبہ موجزن تھا جو ستائیس سال بعد ۱۸۵۷ء میں ایک دفعہ پھر شدت کے ساتھ ظاہر ہوا اور انگریزوں کو اپنے قدم اکھڑتے نظر آئے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اس انقلاب پر قابو پالیا۔

۱۸۳۰ء اور ۱۸۵۷ء میں دو بڑی ناکامیوں کے بعد علماء نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کر لی اب براہِ راست مزاحمت کرنے کے بجائے تعلیم وتعلم کی آڑ میں خفیہ اور منظم طریقہ سے جدو جہد آزادی کی تحریک کو جاری رکھا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ۱۸۵۷ء کی جدو جہد آزادی میں عملی طور پر حصہ لینے والے چند علماء نے جن میں مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے نام

قابل ذکر ہیں۔ ایک غیر معروف قصبہ دیوبند میں دار العلوم کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد علوم دینیہ کی حفاظت اور ملی تشخص کی بقا کے ساتھ ساتھ جدو جہد آزادی کی تحریک کو ایک نئی سمت عطا کرنا تھا۔ چنانچہ دار العلوم کے اول طالب علم شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا کہنا ہے:

> ''جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے'' (سوانح قاسمی۔ص:۲۲۶)

حضرت شیخ الہند نے اس فکر کو بخوبی سمجھا اور اپنے اسلاف کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی غرض سے انتہائی خفیہ تحریک چلائی جو برطانوی حکومت کے محکمہ خفیہ کی رپورٹوں کے مطابق ''ریشمی خطوط سازش'' اور عرفِ عام میں تحریک ریشمی رومال'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ بانی تحریک کی جانب سے یہ نام نہیں دیا گیا بلکہ ریشمی رومال میں لکھے ہوئے چند پیغامات انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے جس کی بناء پر انگریز اپنی تحقیقاتی رپورٹوں میں ''ریشمی خطوط سازش'' لکھتے چلے گئے اور حکومت ایسی دھوکہ کھائی کہ تحریک کا اصل محرک کون ہے پتہ نہ لگا سکی۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو ہی تحریک کا بانی قرار دیدیا کیونکہ خطوط عبید اللہ سندھی نے لکھا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے روز اول سے ہی جو حکمتِ عملی اپنائی تھی وہ قابل تحسین ہے۔ دار العلوم دیوبند کے قیام کے چند برسوں کے اندر ۱۸۷۸ء میں انہوں نے ''ثمرۃ التربیت'' نام سے ایک تنظیم بنائی۔ بہ ظاہر اس کا مقصد ہمدردانِ مدرسہ سے رابطہ رکھنا تھا۔ لیکن ایسے وقت میں جب کہ برطانوی سامراج کا سورج ہر چھوٹی بڑی حرکتوں پر نظر رکھنے کی قوت رکھتا تھا شاید اس کی نظروں سے یہ چوک ہوگئی اور تنظیم بڑی خاموشی سے اپنا کام کئے جا رہی تھی۔ مشہور مورخ مولانا محمد میاں اپنی طالب علمی کے دور کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۱۹۶۰ء کے دہے میں دار العلوم کے ہر طالب علم کے جذبات یہ تھے کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا ہر ایک خوددار ہندوستانی کا فرض اولین ہے۔ طلباء اسی جذبہ کو نمودِ زندگی سمجھتے تھے

''ثمرۃ التربیت'' کے قیام کے چند برسوں بعد دہلی میں ''نظارۃ المعارف'' قائم کر کے مولانا عبید اللہ سندھی کو کنویز بنایا گیا۔ اس وقت کے اہم سیاسی رہنما مثلاً حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا آزاد وغیرہ نظارۃ المعارف میں جمع ہوتے اور تبادلہ خیال کرتے۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ کے مطابق نظارۃ المعارف ایک دار المنشور تھا جس کے روح رواں شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھے۔

پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے مولانا محمود الحسن نے عبید اللہ سندھی کو کابل روانہ کیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل روانہ کیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ کابل روانہ ہونے سے قبل انہیں کچھ نہیں بتایا گیا کہ کیوں بھیجا جا رہا ہے لیکن وہاں۔ پہنچ کر اندازہ ہوا کہ چالیس سال کی محنتوں کا نتیجہ میرے سامنے ہے۔ یاغستان اور سرحد کے آزاد قبائل میں ہزاروں رضا کاروں اور مجاہدین کا دستہ حکم کے انتظار میں ہے۔ مولانا سندھی نے سردار نصر اللہ خان اور امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کی اُدھر جنگ عظیم کے چھڑنے پر شیخ الہند حج کی نیت سے حجاز روانہ ہوئے۔ جب کہ اصلی مقصد یہ تھا کہ وہاں پہنچ کر ترکی، فرانس و جرمنی وغیرہ سے تعاون حاصل کیا جائے۔ ترکی کے اعلیٰ عہدہ داروں سے ملاقات بھی کی۔ مولانا سندھی حالات سے واقف کرانے کے لئے شیخ الہند کو خفیہ طریقہ سے ریشمی خطوط حجاز بھیجنا چاہا خطوط پکڑے جانے کی وجہ سے عبید اللہ سندھی افغانستان سے نکل کر ماسکو پہنچے پھر استنبو کئی برسوں تک رہنے کے بعد مکہ معظمہ آئے اور 24 سال کے طویل عرصہ کے بعد ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس ہوئے۔ راز افشاء ہونے کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو مع چند رفقاء، حجاز مقدس سے گرفتار کرلیا گیا اور یورپ کے جزیرہ مالٹا میں ساڑھے تین سال تک سخت قید و بند میں رکھا۔ ۸/ جون ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے رہا ہو کر جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن ممبئی کے ساحل پر اترے تو ہزاروں افراد، سیاسی رہنما، مختلف تنظیموں کے قائد اور ہر مذہب وملت کے لوگ استقبال کے لئے موجود تھے۔ استقبال کرنیوالوں میں موہن داس کرم چند گاندھی بھی شامل تھے۔ انتہائی سخت علالت میں مسلم یونیورسٹی آپ تشریف لے گئے اور ترک موالات کو درست ٹھہراتے ہوئے ایک آزاد اور نیشنل یونیورسٹی کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ ان کے ہاتھوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔

اب یہ بات ذہن میں تازہ کرلیں تحریک سے وابستہ اکثر افراد کی زبان اردو تھی، مراسلت، پیغامات ودیگر ضروری تحریروں کے لئے اردو زبان کا ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ ریشمی خطوط بھی اردو ہی میں لکھے گئے۔ اس کا متن بھی کچھ دیر بعد آپ ملاحظہ کریں گے۔ بہر حال خطوط کی نوعیت کیا تھی۔ اور یہ انگریزوں کے ہاتھ کیسے لگے؟ یہ بھی بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے مولانا محمودالحسن کی ایماء پر عبید اللہ سندھی ۱۹۱۵ء میں بہاولپور، ملتان اور سندھ ہوتے ہوئے افغانستان پہنچے۔ انہوں نے اپنے کوائف وحالات اور آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں دو خط شیخ الہند کے نام ریشم کے کپڑے میں تحریر کیے اور ایک خط آچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی شیخ عبدالرحیم کو تحریر کیا کہ یہ پیغام شیخ خود لے کر حجاز چلے جائیں یا کسی معتبر حاجی کے ذریعہ حضرت شیخ الہند تک پہنچادیں۔ جملہ تینوں خطوط پنجاب کے حاکم اللہ نواز خاں کے اتالیق عبدالحق کو دیئے کہ شیخ عبدالرحیم کو یہ پہنچادیں لیکن خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ عبدالحق نے یہ خطوط اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر رجب نواز کو دیدیے اور پھر رب نواز نے پنجاب کے گورنر ''مائیکل ایڈوائر'' تک ریشمی خطوط پہنچادیئے۔ اس طرح برطانوی حکومت کو اس تحریک کے کچھ راز معلوم ہوگئے اسی وقت شیخ عبد الرحیم کا تعاقب کیا گیا اور مولانا محمودالحسن کو گرفتار کرکے پہلے مصر پھر جزیرہ مالٹا میں قید کردیا۔

> اس وقت کا انٹلی جنس ڈائرکٹر اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے ''ریشمی خطوط گذشتہ ماہ (اگست ۱۹۱۶ء) کی ۳۰ تاریخ کو میرے دفتر میں موصول ہوئے یعنی اس وقت جب کہ ایک سال پہلے اگست ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کابل پہنچ چکے ہیں اور آزاد قبائل میں اپنا کام کرچکے ہیں۔ مولانا محمودالحسن اگست ۱۹۱۵ء میں دیوبند سے روانہ ہوکر ۳۰ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مکہ معظمہ پہنچ چکے ہیں۔ وہاں غالب پاشا سے ملاقات کرکے فرمان حاصل کرچکے ہیں۔'' (نقش حیات ص:۲۳۸ مولانا حسین احمد مدنی)

اس تحریک کے تعلق سے یہ بات بھی بڑی حیرت انگریز ہے جدوجہد آزادی کی تمام تحریکوں میں شاید یہ واحد تحریک ہے کہ جس کا نیٹ ورک کئی ممالک تک پھیلا ہونے کے باوجود آخر تک

برطانوی حکومت کا محکمہ انٹلی جنس اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے بھی بانی تحریک اور اس کے طریقہ کار کا پتہ نہ لگا سکی۔ انڈیا آفس لندن میں موجود ریکارڈ کے مطابق تحریک کا اصل بانی عبیداللہ سندھی کو قرار دیا ہے۔ شاید ایسا اس لئے ہوا کہ ریشمی خطوط عبیداللہ سندھی کی جانب سے لکھے گئے تھے۔

انڈیا آفس لندن میں موجود خفیہ ریکارڈوں میں ایک ہزار سے زیادہ صفحات اس تحریک کے تعلق سے ہے ان میں تقریباً پانچ سو صفحات میں وہ بیانات ہیں جسے "استغاثہ از ملک معظم بنام عبید اللہ" ہے اس استغاثہ میں ۵۹ افراد کے نام پتہ کے ساتھ درج ہیں جن کے خلاف وارنٹ جاری ہوا ان میں ۷ افراد حراست میں لئے گئے باقی برطانوی ہند سے فرار ہو چکے تھے سترہ افراد کے بیانات تفصیل سے لئے گئے۔ یہ سترہ افراد ملک کے مختلف حصوں کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں چار دیوبند، دو مظفر نگر اور سہارنپور، علی گڑھ، بجنور، مرادآباد، پانی پت، شیر کوٹ، دربھنگہ، گوجرانوالہ، سکھ، جہلم اور گجرات کے ایک ایک فرد ہیں۔

تحریک کی رپورٹ کے سرورس پر Political and Secrel Deportmant تحریر ہے۔ اسی صفحہ پر نیچے Matter for Silky letters یعنی ریشمی خطوط کا معاملہ اور فائیلوں کے نمبرات درج ہیں۔ آخر میں بائیں جانب "جے ڈبلیو ہول" کے دستخط ہیں۔ تاریخ یکم اگست ۱۹۱۸ء درج ہے۔ یہ خطوط کیسے حاصل ہوئے اس کا ذکر آچکا ہے۔ ان خطوط کے سائز بھی درج ہیں۔ لکھا ہے کہ یہ خطوط ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر ہیں پہلا خط شیخ عبدالحق کے نام ہے جو چھ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا ہے۔ دوسرا خط شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے نام ہے جو دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا ہے۔ تیسرا خط بمعنی دوسرے کے تسلسل میں ہے جو پندرہ انچ لمبا اور دس انچ چوڑا ہے آخر میں عبیداللہ سندھی کے دستخط ہیں۔ تمام خطوط اردو میں لکھے گئے ہیں۔ پھر عبیداللہ سندھی کے بارے میں تفصیل درج ہے۔

خط کے مضمون کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ پہلا خط تو شیخ عبدالرحیم کو لکھا گیا ہے کہ کس طرح اس خط (یعنی دوسرے اور تیسرے) کو حجاز کسی معتبر حاجی کے توسط سے مولانا محمود الحسن تک پہنچانا

ہے۔ دوسرا خط اپنے سفر کی تفصیل سے شروع کرتے ہیں پھر یہ کہا گیا ہے کہ عبید اللہ نے خط مبہم لکھا ہے جو کہ تشریح طلب ہے نام مختصر ہیں۔ مثلاً صرف ڈاکٹر صاحب پھر خود ہی لکھا ہے کہ شاید ڈاکٹر سے مراد ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہیں یا کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ درست ہے کہ یہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہی ہیں جو کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو تحریک کے لئے سب سے زیادہ مالی تعاون کرتے تھے۔ مولانا کا انتقال بھی دریا گنج، نئی دہلی میں واقع ان کی کوٹھی پر ہوا تھا ان کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہیں ان کے خلاف زبردست شہادتیں منظر عام پر آسکتی ہے۔ خط میں پھر افغانستان کے حالات اور مستقبل کا پروگرام ونقشہ بیان کیا ہے ''جنودِ ربانیہ'' کے عہدہ داروں کی فہرست بھی درج ہے جو عالم اسلام کے ممتاز ترین شخصیتوں پر مشتمل ہے۔ عبید اللہ سندھی نے افغانستان میں قیام کے دوران جنودِ ربانیہ نام کی تنظیم قائم کی تھی خط کے آخر میں حکومت کی تشکیل اور تفصیل بھی دی گئی ہے جس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ سنگھ اور وزیر اعظم مولوی برکت اللہ بھوپالی کو بنایا گیا ہے۔ اتنی تفصیل کے بعد اب آپ بھی خط کا اصل متن ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا خط شیخ عبد الرحیم کے نام ہے۔ تاریخ ۱۵ر جولائی ۱۹۱۶ء درج ہے۔

سلام مسنون!

آپ ضرور یہ امانت مدینہ طیبہ میں حضرت مولانا کی خدمت مین کسی معتمد حاجی کی معرفت پہنچادیں۔ یہ ایسا کام ہے کہ اس کے لئے مستقل سفر کرنا نقصان نہیں۔ اگر آدمی معتمد ہو تو زبانی یہ بھی کہہ دیں کہ حضرت مولانا یہاں آنے کی بالکل کوشش نہ کریں اور مولوی منصور اگر اس حج پر نہ آسکیں تو خیال فرمالیں کہ اس کا آنا ممکن نہیں۔

آپ اس کے بعد خود میرے پاس آنے کی کوشش کریں کیونکہ یہاں بہت سے ضروری کام ہیں، ضرور آیئے۔

اگر خدانخواستہ آپ کو معتمد حاجی نہ مل سکے اور آپ خود بھی نہ جا سکیں تو مولوی حمد اللہ ساکن پانی پت سے اس معاملہ میں مدد لیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس حج کے موقعہ پر یہ اطلاعات حضرت مولانا کے پاس پہنچ جائیں اور وہاں سے جو اطلاع ملے۔ وہ براہِ راست نہ ہو سکے تو مولوی احمد لاہوری کی معرفت ضرور ہمیں ملنی چاہیے۔''

عبیداللہ عفی عنہ

دوسرا اور تیسرا خط تسلسل کے ساتھ شیخ الہند کے نام ہے تاریخ ۹ر جولائی درج ہے۔ لکھتے ہیں:

بغیر دستخط کا خط مورخہ ۹ جولائی

از کابل

۸ر رمضان المبارک

روز ابتداء

وسیلۃ یومی وغدی حضرت مولانا صاحب مدظلہم العالی

آداب و نیاز مسنونہ

جدہ کے بعد کا حال یہ ہے۔ بمبئی آرام و بے خطر پہنچے۔ بندر پر اسباب کی تلاشی میں خدام سے دانستہ اغماض برتا گیا۔ فللہ الحمد۔ مولانا مرتضیٰ صاحب کام کو ناممکن خیال کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو کام میں نہیں لیا گیا۔ مولوی ظہور صاحب بمبئی استقبال کو پہنچے تھے اور محمد حسین راندیرے، راندیر میں تحریک چندہ صرف سید صاحب کے خلاف سے ناکام رہی۔ راندیر خطیب مکرر جانے والے تھے نہ معلوم کیا ہوا۔ قاضی صاحب نے بعد ملاحظہ والا نامہ سرپرستی قبول فرمائی۔ حمایت پر اعتماد بحال رکھ کر کام کرنے کی اجازت دی۔ اس کام کو باضابطہ کرنے کے لیے ایک رسالہ رخصت لینے کا قصد فرمارہے ہیں۔ جماعت کے ہر سہ ممبر سرفروشی کر رہے

ہیں مطلوب الگ ہوگیا۔ سید نورست مولانا رائے والے متفق و معاون ہیں حکیم صاحب پچاس روپے ماہوار مکان پر جا کر خود دیتے رہتے ہیں۔ اور درمیان میں بھی ایک دوبارہ جاتے رہتے ہیں اور گاہ بگاہ ڈاکٹر صاحب بھی۔ حنیف کو جماعت دس روپیہ جیب خرچ دیتی ہے۔ وہ مکان پر ہی ہیں۔ مدرسہ نے ان سے کوئی ہمدردی نہیں کی۔ مالکان مدرسہ سرکار کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں نمائش کے دربار میں شرکت کا فخر بھی نصیب ہونے لگا۔ (۲۵۳)

امیر شاہ مولانا عبدالرحیم صاحب کے دستی کام کے لیے پڑا ہے۔ مولانا مدرسہ سے مرعوب ہیں مگر خدام کی صفائی فرماتے رہتے ہیں۔ مولوی رامپوری نے بھی تائید سے کنارہ کیا۔ مسعود بھی شکار ہوگیا۔

بندہ حسرت آزاد سے ملا۔ دونوں بیکار ہو چکے ہیں کیونکہ بندہ کا لوٹنا حضور تک ممکن نہ تھا۔ اس لئے آگے بڑھا۔

غالب نامہ احباب ہند کو دکھا کر حضرت یاغستان کے پاس لایا۔ حاجی بھی اب مہمند میں ہیں۔ مہاجرین نے مہمند باجوڑ صوات بنیر وغیرہ علاقوں میں آگ لگا رکھی ہے۔ ان علاقوں میں غالب نامہ کی اشاعت کا خاص اثر ہوا۔ اس لئے ضروری ہے کہ حسب وعدہ غالب مصالحت کے وقت یاغستان کی خدمت کا خیال رکھا جائے۔ ضعف جماعت ہند سے مجاہرین کو کافی امداد نہیں پہنچ سکی۔ بندہ یاغستان ایک ماہ قیام کر کے وفد مہاجرین کے ساتھ کابل پہنچا۔ مولانا سیف جماعت سے الگ ہو کر یہاں مقیم ہیں۔ ان کے لئے دولت کی طرف سے کام کی تجویز ہو رہی ہے۔ اعضائے وفد فضلین (عبدالعزیز ہیں۔ مولانا الناظم کی توجہات و حاجی عبد الرزاق صاحب کی عنایات سے وفد کو دوبار نصر اللہ میں رسائی کی ابتدائی کامیابی بھی ہوئی۔ بندہ ان سے الگ باریاب ہوا۔ حضور کے زیر اثر کام اور اس کے اصول کی تفصیل کی گئی۔ خاص قبولیت ہوئی الحمد للہ اور انشاء اللہ اس ذیل میں حاضر خدمت ہوں گا۔

یہاں کا حال یہ ہے یہاں فتاویٰ وسفرائے ترک و جرمن پہنچے ان کا اعزاز پورا ہوا۔ لیکن مقصد میں ناکام رہے۔ وجہ یہ ہے کہ ترکی کا فرض تھا کہ ایام ناظر

فداری میں ایران و افغانستان سے ان کی ضروریات معلوم کرتا۔ اس کے پورا کرنے کی سبیل کرتا اور حسب احوال معاہدہ دوستی کرتا۔ افغانستان نہ بڑی جنگ میں شرکت کا سامان رکھتا ہے اور نہ کوئی بڑی دولت اس کے نقصانات کی تلافی کی ذمہدار ہے۔ اس لئے شریک حرب نہیں ہوسکتا۔ اگر ضروری افسران انجینئر ان اسلحہ روپیہ دیا جائے اور بصورت غلبہ کفر عصمت و اعانت کا عہد نامہ کیا جائے تو شرکت کے لیے تیار ہیں۔ باایں ہمہ سردار نائب السلطنت عام سرحدی وزیر۔ آفریدی۔ مہمند۔ باجوڑ۔ صوتا۔ نبیر۔ پکلیسر۔ غور بند۔ کرناہ۔ کوہستان۔ ویر۔ چترال وغیرہ میں اپنا اثر منظم کرتے اور ان سے وکلا طلب کر کے عہد شرکت بصورت جنگ لے رہے ہیں۔ یہ کام ایک حد تک ہو چکا ہے۔ سفراء جرمن واپس اور ترک مقیم ہیں۔ مگر بے کار۔ تعجب ہے کہ سفراء خالی ہاتھ آئے حتی کہ کوئی کافی سند سفارت بھی نہ لائے۔ ایسی صورت میں کیا ہوسکتا ہے۔ مولانا الناظم با عافیت ہیں۔ دولت میں ایک حد تک اعتماد ہوگیا ہے۔ انگریز ان کو یہاں جاسوس ثابت کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ جن کا کچھ نہ کچھ اثر بھی ہوتا ہے۔ مگر الحمد للہ کہ ان کو اب تک پوری کامیابی نہیں ہوئی۔

مہاجدین طلباء انگریزی اور بعض سکھ بھی اب یہاں حاجی عبد الرزاق صاحب کی مدد و نائب کی مہربانی سے آزاد ہیں اور مولانا الناظم کی زیر سرپرستی دیئے گئے ہیں۔ مصارف بذمہ دولت ہیں۔ کوئی سرکاری کام ان کے ذمہ نہیں ہے۔ البتہ مولانا کے خاص کاموں میں بہ ایمائے نائب السطنت و بازو ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

ایک جمعیۃ ہندوستان آزاد کرانے والی اس کا صدر ایک ہندی راجہ مقیم کابل ہے جو کہ سلطان المعظم اور قیصر جرمنی کے اعتماد نامہ کے ساتھ یہاں پہنچا ہے ناظم صاحب و مولوی برکت اللہ اس جماعت کے وزراء ہیں۔ اس جماعت نے ہندوستان میں مراکز و دیگر ودل سے معاہدات کرنے کے لئے حرکت کی ہے جس میں ابتدائی کامیابی ہوئی ہے۔ اس کام میں عضو متحرک طلباء ہی ہیں۔ ان میں بعض دربار خلافت ہو کر حاضر خدمت ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

دوسری جماعت الجنود الربانیہ۔ یہ فوجی اصول پر مخصوص اسلامی جماعت ہے جس کا مقصد اولیہ سلاطین اسلام میں اعتماد پیدا کرنا ہے۔ اس کا صدر جس کا نام فوجی قاعدہ سے جنرل یا القائد ہے۔ حضور کو قرار دیا گیا ہے اور مرکز اصلی مدینہ منورہ اس لئے خیال ہے کہ حضور مدینہ منورہ میں رہ کر خلافت علیا سے افغانستان و ایران کے ساتھ معاہدہ کی سعی فرمائیں اور افغانستان کے متعلق' نیز یاغستان کے متعلق تجویز کو خدام تک پہنچا دینا کافی خیال فرمائیں۔

افغانستان شرکت جنگ کے لئے امور مذکورہ بالا کا طالب ہے۔ جسے اولیاء دولت عثمانیہ و خلافت ثانیہ تک پہنچانے کی جلد سے جلد تدبیر کیجئے۔ کیوں کہ ہندوستان میں کفر پر کاری ضرب لگانے کی یہی ایک صورت ہے۔ اہل مدرسہ مولوی محسن سید نور کے ذریعہ حضور کی ہند میں لانے کی سعی میں ہیں۔ کیونکہ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ حجاز میں بھی کام ہوسکتا ہے۔ ادھر انگریزوں میں پہلی سی عزت بوجہ عدم ضرورت اب نہیں رہی۔

قاضی صاحب حکیم صاحب ڈاکٹر صاحب مولانا رائے والے حضور کی مراجعت ہند کے سخت مخالف ہیں۔ خطرہ بہ وجہ قصہ غالب کے علم ہونے کے بذریعہ مطلوب اب پہلے سے بہت بڑھ گیاہ۔ اس لئے ایسی کسی تحریک کو ہرگز ہرگز منظور نہ فرمایا جائے۔

مبلغ عطاء حضور کے مکان پر اور سید نور کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے جماعت کے سپرد کر دیا گیا۔ بندہ حصول قدم بوسی کی سعی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ کامیاب ہوں گا۔ الناظم مولانا سیف فضلین و عبدالعزیز و جملہ مہاجرین طلباء وسلام عرض کرتے ہیں۔ برادر عزیز واحد مولانا حسین ان کے والد صاحب و برادران وحرمت اللہ واحمد جان صاحبان کی خدمت میں سلام مسنون۔ مدنی خطوط ہند کی ڈاک کے حوالہ کر دیئے گئے تھے۔ ڈاکٹر شاہ بخش صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔ وسید ہادی وخدا بخش وحبیب اللہ غازی کو بھی۔"

برطانوی حکومت کی نظر میں ان خطوط کی کتنی اہمیت تھی کہ اس سے اندازہ لگائیے کہ محکمہ خفیہ نے ہزار صفحات اس کی تحقیق پر سیاہ کردیئے اور اپنی رپورٹ میں جدوجہد آزادی کے تعلق سے بعض حیرت انگریز انکشافات کئے جو شاید ہی کہیں محفوظ اور قلمبند کئے گئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب مورخ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ لکھتا ہے تو اسے یکسر نظرانداز کرجاتا ہے۔اس سلسلے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو یہ میرا مخلصانہ مشورہ اور تجویز ہے کہ جب یہاں شعبہ تاریخ کی نصابی کتابیں تیار کی جائیں تو اس تحریک کو بھی شامل کرکے آنے والی نسلوں کو اس سے روشناس کرایا جائے۔ ورنہ اسے ایک فرض داستان کہنے والا بھی کوئی نہیں رہے گا۔

(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ۱۳؍مارچ ۲۰۰۷ءکو انٹرنیشنل اردو کانفرنس میں پڑھا گیا مقالہ'' کانفرنس کا مرکزی عنوان تھا''جدوجہد آزادی اور اردو'')

☆☆☆
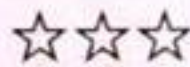
جاوید ندیم، خیال موسم اور فکری رویہ

کوئی پندرہ برس قبل کرسچین کالج لکھنؤ سے گریجویشن کرنے کے بعد جب میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے شعبہ اردو میں ایم اے کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا تو اُس وقت سے لے کر آج تک ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ یہ کشمکش اس لئے نہیں تھی کہ میں ایک بہتر یونیورسٹی کا ایک کمتر طالب علم تھا یا جے این یو کے مغرب زدہ ماحول سے خوف زدہ تھا نہیں! بلکہ جے این یو کے تعلیمی ماحول سے میں نے کئی برسوں تک بھرپور استفادہ کیا اور واقعہ یہ ہے کہ وہاں کی ذہنی کشادگی و بالیدگی تو مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔ دراصل مجھے کشمکش میں مبتلا شعبۂ اردو نے کیا۔

میں نے ایک مذہبی خاندان میں آنکھیں کھولی ہیں اس لئے اردو کو خانقاہوں، مدرسوں، صوفیاء اور علماء سے صرف نظر کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اب جب کہ میں اعلیٰ تعلیمی سرکاری اداروں کے محبان اردو کو دیکھتا ہوں تو ان میں کی اکثریت اپنی تدریس، تصنیف، تنقید، شاعری اور نثر نگاری گویا ہر جگہ مذہب سے برگشتہ خدا سے بیزار اور خدا ترسوں سے بیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے ایک کرم فرما استاد نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ آپ غلطی سے اردو میں آ گئے۔ آپ کی جگہ تو شعبۂ عربی ہے۔ میرے ایک درسی ساتھی واقعی گھبرا کر شعبہ عربی میں چلے گئے۔ بہر حال یہ وجہ تھی میرے کشمکش میں مبتلا ہونے کی۔ خدا جزائے خیر دے جاوید ندیم صاحب کو کہ ان کی فکر کو پڑھ کر میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور یاس آس میں بدلتا ہوا نظر آیا۔ انہوں نے اعتدال پسندی کی جس طرح پُر زور وکالت کی ہے اور نئی نسل کو اس فکری رویہ میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے اس سے لگتا

ہے کہ انشاءاللہ وہ دن دور نہیں جب ہمارے ادب کا منظر نامہ بدلے گا اور بقول جاوید ندیم کہ اس ادیب کے ساتھ خدا ہے۔ وہ ادب کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

''ادب علم نہیں---احساس ہے۔ احساس کو بیدار کرنے کا ذریعہ ہے یہ معاملات عقل سے نہیں، وارداتِ قلب سے بحث کرتا ہے، معقولیت ادب کے لئے شرط نہیں، اس کا جز ہے۔ شرط جذبہ ہے اور میرے نزدیک مقصدیت بھی وہ کج فکری کی حامل نہ ہو ایسی نہیں جو سابق تحریکوں کے علم برداروں کی تھی کہ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو سے ایسے چمٹے کہ دیگر تمام پہلوؤں سے آنکھیں پھیر لیں۔ یہ انتہا پسندی تھی اور انتہا پسندی زندگی کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ زندگی اور کائنات کے مزاج میں اعتدال ہے، شدت نہیں اور جہاں شدت آئی حادثات رونما ہوئے''۔

(خیال موسم، شعری مجموعہ، جاوید ندیم، تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی ۲۰۰۷ء، ص:۱۶)

واقعی یہ حقیقت ہے کہ ادب میں اٹھنے والی تحریکیں، انتہا پسندی کا شکار ہو گئیں کیونکہ کسی ایک پہلو کو سب کچھ سمجھ کر زور صرف کر دیا گیا اور دیگر پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ اب دیکھئے ہمارے ترقی پسند حضرات ''انسانیت'' کی تسبیح اور اس کا وظیفہ اتنے خشوع سے دہائیوں تک پڑھتے رہے کہ ان سے ذرا بھی اختلاف کرنے والا خود اپنی ہی نظروں میں معتوب ٹھہر جاتا۔ لیکن ترقی پسندوں کا انسان ایک ایسا انسان تھا جس کے پاس صرف ''پیٹ'' تھا۔ اور وہ دل، جذبہ، احساس اور روحانی طمانیت سے بے گانہ تھا۔ چنانچہ تہذیب، اخلاق اطوار، کردار اور اقدار تو بعد کی بات ہے۔ اردو والوں پر پھر جدیدیت کا بخار چڑھا اور یہ بخار اتنا تیز تھا کہ کچھ سُجھائی نہ دیا اور ہذیانی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ ان کی بڑبڑاہٹ کو قاری سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے۔ پھر ہم نے مغرب کی طرف دیکھا تو سمندر پار کے افق پر کچھ سرخی نظر آئی لیکن وہاں غروب ہونے کے بعد یہ سرخی یہاں ''مابعد جدیدیت'' کے نام سے طلوع ہوئی ''سوسیئر'' اور ''ژاک دریدا'' جنہوں نے ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہمارے ادیبوں کے پیشوا بن گئے۔ ان فکری رویوں کی آمد

سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ اردو دانشور حضرات تشکیک، تذبذب، انتشار ذہنی اور مادہ پرستی کے شکار ہو گئے اور اردو ادب میں چاہے تنقید ہو یا تخلیق اس کے گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ انسانی زندگی کے سب سے موثر اور اہم پہلو کو نظر انداز کر کے ادب میں جھول پیدا کر دیا گیا۔ جب کہ یقین، اخلاق اور اقدار سے زندگی میں اعتدال آتا ہے اور یہی اعتدال ادب میں منتقل ہوتا ہے۔

جاوید ندیم کا کہنا ہے۔

> ''اعتدال پسندوں کے یہاں بے یقینی نہیں، تیقن ہے، تشکیک نہیں اعتبار ہے، انتشار نہیں، ارتکاز ہے۔ اضمحلال نہیں، استقلال ہے۔ انہزام نہیں، انضمام ہے۔.........قدروں سے بیزاری نہیں بلکہ استواری کا جذبہ ہے۔ مسائل زندگی سے فرار نہیں بلکہ حقائق سے رُوبرو ہونے کا حوصلہ ہے۔ اعتدال پسندی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ادیب کے ساتھ خدا ہے''۔

(خیال موسم، جاوید ندیم، تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی) ص: ۱۷)

اعتدال پسندی کا رویہ ۱۹۸۰ء کے بعد پروان چڑھا۔ مگر جیسی امید کی جاتی تھی اس طرح نئی نسل آگے نہیں بڑھی چونکہ یہ تحریک نہیں بلکہ مزاج ہے جو کہ فطری ہے مگر وسیع مطالعہ اور تجربات کی کمی نے فطری مزاج کے اس اعتدال پسندی کو چوٹ پہنچائی جس کی تلافی نئے عزم، عالمکاری اور صارفیت کی بدلتی ہوئی دنیا سے آگاہی اور انسانی معاشرے پر اس کے گہرے اثرات کو ادب کا آلہ کار پیش کر کے کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال جاوید ندیم نے نئی نسل کو بیدار کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

یہاں پر جاوید ندیم کے مجموعہ کلام ''خیال موسم'' کے تعلق سے کچھ کہنا چاہوں گا۔ اتر پردیش کے ضلع بجنور سے تعلق رکھنے والے اور عروس البلاد ممبئی میں قیام پذیر جاوید ندیم کا یہ اردو کلام ہے جب کہ ہندی میں بھی وہ شاعری کرتے ہیں۔ شاعر کے علاوہ وہ مفکر بھی ہیں۔ انتہائی بصیرت افروز فکر پاروں کو انہوں نے ''موج خیال''، ''عکس خیال'' اور ''رنگ خیال'' نام سے موسوم کیا ہے۔ بہر حال ''خیال موسم'' کے تعلق سے جو کچھ میں کہوں گا یہ بات میری نہیں ہوگی بلکہ خود شاعر کے جذبات

واحساسات ہوں گے۔ اس لئے کہ ''ڈبلیو میکیل'' کے اس اصول کو میں مانتا ہوں کہ شاعری کے بارے میں بیانات نہیں ہیں محض شاعر کے تاثرات ومحسوسات ہیں اوران کا مقصود صرف یہ ہے کہ قاری کوان تاثرات سے آگاہ کیا جائے نہ کہ اسے شاعری کے بارے میں کچھ بتایا جائے۔

خیال موسم میں ایک حمد، ایک نعت، ۹۸ غزلیں اور پانچ شخصی مرثیے ہیں۔ یہ پانچوں مرثیے مرحوم ومغفور نشتر خانقاہی پر کہے گئے ہیں جو کہ جاوید ندیم کے مربی ومشفق استاد تھے۔ مرثیہ کا ایک ایک شعر تعلق خاطر کا پتہ دیتا ہے۔ مجموعہ کلام کی ۹۸ غزلوں کو پڑھنے کے بعد جاوید ندیم کی فکر، احساس، جذبہ، کرب، تنہائی کا احساس، زندگی سے نبرد آزمائی، بڑے شہروں کے مسائل، معاشرے پر چوٹ اور ہجر ووصال کی لذت وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزل کا اصلی رنگ دیکھئے۔

قتل ہر بار مجھی کو وہ کیا کرتا ہے
کوئی بتلائے تو آخر یہ تماشہ کیا ہے؟

سوچا تھا وہ ملے تو کریں گے شکایتیں
وہ جب ملا تو ملتے ہی سارا گلہ گیا

پہلا سا ربط ضبط نہ مجھ سے رہا اسے
پھر رفتہ رفتہ میں بھی اُسے بھولتا گیا

اب آکے ہم نے شعر غزل کے کہے ندیم
تھا جذب و فکر میں جو کبھی فاصلہ گیا

بن تمہارے رہی بے قراری بہت
لمحہ لمحہ رہا دل پہ بھاری بہت

یاد بن کر مہکتا رہے گا سدا
زخم اس نے دیا ہم کو کاری بہت

☆☆☆

شاعری میں جب تک تنوع نہ ہو وہ زندگی سے قریب نہیں ہو سکتی اس لئے کہ انسان، معاشرہ اور کائنات کی تثلیث میں یہی سب سے بڑی سچائی ہے۔ خیر و شر، نیکی و بدی، خلوت و جلوت، فقر و تونگری، صحت و بیماری، رحم و ظلم، فرصت و مشغولی، درد و داماں، یقین و شک دوستی و دشمنی اور اخلاص وریا وغیرہ خصوصیات کے حامل انسانی معاشرہ سے ہی اس کائنات کی رونق ہے۔ ان تمام چیزوں کی ایک شاعر جتنی بہتر طریقے سے ترجمانی کرتا ہے۔ شاید کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اب دیکھئے شاعر نے اپنے وجود اور عزم پھر رقیبوں کی آمد اور انجام کا ذکر کتنے بہترین پیرایہ میں کیا ہے۔

میں تو خوشبو ہوں، ہوا کے ساتھ جانا ہے مجھے
روک پاؤ گے مجھے کب ، بن کے یوں دیوار تم

تم نے خود اپنے لئے ڈھونڈا تباہی کا سبب
میں کہ اک سیل رواں تھا، کیوں بنے دیوار تم ؟

☆☆☆

اس کائنات میں جب تک رفیق کے ساتھ رقیب نہ ہو بات نہیں بنتی ابھی تو کہاں شاعر رقیبوں کو دیوار کا استعارہ بتا کر اس کی تباہی کا اشارہ بھی دے رہا ہے۔

پھر فوراً ہی اپنے اوپر بے یقینی کی کیفیت طاری کر لیتا ہے۔

میں ہوا ہوں ، بخت ہے آوارگی میرا ندیم
گھومتے ہو بستی بستی کس لئے بے زار تم

گھومتے گھومتے شاعر پھر اپنے آپ کو تنہا بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

بیٹھتے مل کے، باتیں ہوتیں، حالِ دل کچھ ہم بھی کہتے
لوٹ گئے ہو بنا ملے ہی، یہ بھی کوئی بات ہوئی

سب کی زباں پہ ذکر مری ، صبح و شام کا
اے کاش کوئی کرتا مرے رتجگوں کی بات

شاعر پر ایک موڑ ایسا بھی آیا کہ وہ اپنے فن سے بے زار نظر آتا ہے۔ اور شاعری کو تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ اس میں زندگی کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ حل نہیں کر پاتا۔ چنانچہ جھنجھلا کر کہتا ہے۔

ذوق شعر وسخن ہے خسارے کی لت
زندگی اپنی کا ہے اکارت کرو

کاغذ سیاہ تم نے عبث ہی کئے ندیم
حل شاعری سے کوئی بھی کیا مسئلہ ہوا؟

ہندوستانی شہروں اور گاؤں میں بڑا فرق ہے گاؤں کا جو سکون، امن، محبت اور دوستی ہے وہ شہر میں کہاں؟ بے شک شہروں میں مادی سہولتیں، وسائل کی فراوانی اور زندگی کا ظاہری عیش و آرام ہے مگر انسانی ہمدردی و باہمی تعلقات کی پختگی گاؤں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ شاعر اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اپنا نہ بن کے آئے تو انجان بن کے آ
جس کو نہ بھول پاؤں وہ احسان بن کے آ

شہری تعلقات ضرورت کی دین ہیں
میرے قریب گاؤں کی پہچان بن کے آ

اور یہ اشعار دیکھئے:

شہر آخر کھا گیا قدرت کی سب رنگینیاں
پیٹر، پودے، جھیل، میداں، گھاٹیاں ، کہسار گم

نغمگی شہر کی، جنگل کا فسوں بھی غائب
جتنی رفتار بڑھی ، اتنا سکوں بھی غائب

جاوید ندیم کی پوری شاعری میں زندگی کو مرکزیت حاصل ہے۔ ۹۸ غزلوں میں ۶۰ مرتبہ زندگی، ۸ مرتبہ حیات، ۵ مرتبہ جیون اور دو بار زیست کا استعمال کیا ہے۔ ایک پوری غزل کا قافیہ ہی زندگی ہے۔ ہر ہر زاویے سے زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

کہیں زندگی سے خوش ہیں تو کہیں بیزار، کہیں زندگی کے معانی تلاش کر رہے ہیں تو کہیں زندگی کو نامعتبر گردانتے ہیں، زندگی کو سراب، سفر، درد، بوجھ، دھواں، بے کراں، وحشت، تماشا، دھوپ چھاؤں کا کھیل اور ورق سادہ وغیرہ وغیرہ خدا جانے کیا کیا خطابات دے رہے ہیں۔

زندگی! تجھ کو سمجھا ہے کس نے بتا؟
ساتھ تیرے چلا ہے گماں دور تک

زندگی صحرا سفر ہے جان لیں
سر پہ تپتی دوپہر ہے اور میں

دھوپ چھانو کا کھیل کہہ لیجے
زندگی کیا ہے؟ اک تماشا ہے

اور یہ دیکھئے۔

چل کے دیکھیں کہ لوگ کہتے ہیں
زندگی کے اُدھر بھی رستہ ہے

ذوق سفر ہمارا کسی پل نہ چین دے
شاید ہے زندگی سے پرے راستہ کوئی

• جاوید ندیم کی شاعری میں کوئی بڑا فلسفہ نہیں ہے کہ اس کی موشگافیوں میں الجھ کر شعری محاسن کو بھول جائیں بلکہ تجربات حالات، خیالات اور فکر کو آسان و عام فہم زبان میں برتنے کی کوشش کی ہے اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب ہیں۔ کہیں کہیں ہندی الفاظ کا استعمال بھی بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ مثلاً سپنا، کلپنا، کارن، انت، اکارت اور سنگھرش وغیرہ۔ ان کی فکر معاشرہ کے لئے صحت مند اور ادب کے لئے سودمند ہے۔ جس کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔ یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔ خدا کرے اعتدال پسندی کے اس رجحان کو ہمارے اردو ادب میں جگہ ملے جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں اگر ایسا ہوا تو اردو ادب کے افق پر وہ سورج طلوع ہوگا جو کبھی غروب ہو چکا تھا۔

(7/جون 2007ء کو ممبئی یونیورسٹی ممبئی میں "خیال موسم" کے رسم اجرا کے موقعہ پر پڑھا گیا مقالہ)

سرسیّد کا تاریخی شعور
آثار الصنادید کے حوالے سے

تاریخ نویسی کے تعلق سے سرسید نے دو باتیں کہی ہیں اول یہ کہ قدیم تاریخ کو جدید مذاق کے مطابق از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے، دوسرے یہ کہ اس کا طرز بیان جداگانہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز شامل ہو جائے جس سے دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔ سیاسی اور تعلیمی مسائل کی طرح تاریخ کے بارے میں بھی سرسید کے خیالات بعد میں بدل گئے۔ اب ان کے یہاں تاریخ مقصدیت اور اجتماعیت کے تابع ہو گئی اور یہاں تک کہا کہ مولانا شبلی الفاروق نہ لکھیں تو بہتر ہے۔ ایک بڑی اہم بات انہوں نے یہ کہی کہ کوئی بات مسلمہ اصول اور مشاہدہ و عقل کے خلاف نہ ہو یعنی تاریخ میں مادی وجود کا ہونا لازمی ہے۔ تاریخ کے سلسلہ میں سرسید کا یہ نقطہ نظر اتنا موثر کن تھا کہ ان کے رفقاء میں شبلی اور منشی ذکاء اللہ نے تاریخ نویسی میں اس کو ملحوظ رکھا اور تاریخ میں حس انسانیت کے بجائے حقیقت کا رنگ شامل کیا۔

تاریخ سے متعلق کل سات کتابیں ہیں، جو سرسید کی محنت کا ثمرہ ہیں ان میں تین یعنی 'آئین اکبری' 'تاریخ فیروز شاہی اور 'تزک جہانگیری' ترتیب و تدوین ہیں۔ 'جام جم' پہلی تاریخی تصنیف ہے جن میں بادشاہ تیمور سے لے کر آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک کے فرماں رواؤں کے حالات جدول کی شکل میں تاریخی ترتیب اور تسلسل کے ساتھ درج ہیں۔ دوسری کتاب ''سلسلۃ الملک'' میں دہلی کے ان سارے بادشاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہے جن کا تاریخ ہی تذکرہ

ہے۔ بجنور میں قیام کے دوران سر سید نے بڑی محنت سے ''تاریخ بجنور'' لکھی تھی مگر 1857 کے ہنگامہ کی نذر ہو گئی اور اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ سر سید کی سب سے اہم اور دستاویزی حیثیت کی حامل کتاب ''آثار الصنادید'' ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں سر سید کو بڑی تکلیفیں اور مشقتیں اٹھانی پڑیں، لیکن یہ محنت رائیگاں نہیں گئی ''آثار الصنادید'' کے منظر عام پر آتے ہی پذیرائی شروع ہو گئی، چنانچہ اس وقت دہلی کے مجسٹریٹ مسٹر رابرٹس برطانیہ جاتے ہوئے اس کا ایک نسخہ ساتھ لے گئے اور وہاں اس کو ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی'' میں پیش کیا۔ ممبروں نے بہت پسند کیا اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ لیکن انگریزی میں ترجمہ کی بات ہی ہو رہی تھی کہ مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے 1861ء میں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا۔ اسے دیکھ کر لندن کی ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سر سید کو سوسائٹی کا اعزازی فیلو مقرر کیا۔

میرے سامنے آثار الصنادید کا تازہ ایڈیشن موجود ہے جسے ڈاکٹر خلیق انجم نے مرتب کیا ہے، یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد کا آغاز اسلامی فن تعمیر پر بحث سے ہوتا ہے۔ اور باب اول میں دہلی کے حکمرانوں کا چارٹ دیا گیا ہے جو 1400 ق م کے ''راجہ یدھشر'' سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک ہے۔ دوسرا باب قلعوں کے بننے اور شہروں کے آباد ہونے پر ہے، تیسرا باب مقبروں، مسجدوں اور درگاہوں کے آثار پر مشتمل ہے جسے تفصیل سے دوسری و تیسری جلد میں پیش کیا گیا ہے۔

دوسری جلد میں دہلی کے مشائخین، مجذوبوں، حکیموں، طبیبوں، علماء، قراء، حفاظ، شعراء، خوش نویس اور ارباب موسیقی کا ذکر ہے، تیسری جلد میں، مسجدوں، خانقاہوں، محلوں، قلعوں، مقبروں، اداروں اور درگاہوں وغیرہ کی ایک سو تین 103 تصویریں شامل ہیں اس کے بعد کتبے نقشے ہیں آخر میں لال قلعہ اور اس کی عمارتوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔

''آثار الصنادید'' اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی۔ ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ مصور سے بعینہٖ بنوانا اور سو سے زائد عمارتوں کی صحیح نوعیت معلوم کرنا یقیناً ایک دشوار کام تھا۔ سر سید کے بقول ''قطب صاحب کی لاٹ کے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر

چڑھ کراور چھینکے میں بیٹھتا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔''

''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن 1847 میں شائع ہوا اور دوسرا 1857ء میں مگر ان دونوں ایڈیشنوں میں زبان و بیان اور مواد میں فرق آگیا۔ پہلے ایڈیشن کی زبان مقفیٰ اور مسجع تھی مگر دوسرے ایڈیشن میں زبان کو سادہ اور آسان و عام فہم بنایا گیا۔ یہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اردو نثر کا ارتقائی عمل شروع ہو چلا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں ''اردو زبان کے بیان میں'' نام سے اختتامیہ بھی درج ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن سے ''دہلی اور دہلی کے لوگوں کا بیان'' والا حصہ نکال دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اس زمانے کی علمی اور ادبی تاریخ کے سلسلے میں ایک قیمتی دستاویز ہے۔ دہلی کے آخری دور کی یہ زندہ یادگاریں زوال پذیر عظمت کی چلتی پھرتی نشانیاں ہیں۔ سرسید نے شاید ایڈورڈ تھامس جو دہلی کا سیشن جج تھا' کی ایما پر اس حصے کو نکال دیا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس وقت وہابی تحریک زوروں پر تھی، ان پر الزامات عائد تھے۔ دہلی کے بہت سے علماء اور مشاہیر بھی اس کی زد میں تھے۔ اس بنا پر'' آثار الصنادید'' سے ''دہلی کے لوگوں کے بیان'' والا حصہ نکال دیا گیا۔ بہر حال اب تازہ ایڈیشن میں یہ تمام شامل ہے۔ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن کانپور سے سرسید کے انتقال کے بعد 1904ء میں شائع ہوا۔

''آثار الصنادید'' کے تعلق سے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کی دہلی کا مطالعہ کرنا ہے تو اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے اس لئے معاصرین نے اسے وقعت کی نظر سے دیکھا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ آج بھی اس کی اہمیت ہے مگر ساتھ ہی اس میں وہ کمزوریاں بھی ہیں جو ابتدائی تالیفات میں ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً اس میں بعض ایسے نظریات پائے جاتے ہیں جو جدید تحقیق کی روشنی میں بدل چکے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو زبان کا شاہجہاں کے زمانے میں وجود میں آنا اور زیب النساء کی قبر کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ بہر حال آثار الصنادید کا مقام علمی تحقیقی اور تاریخی دنیا میں بلند ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور افادیت کی گرہیں کھلتی جائیں گی۔

(عالمی سہارا، نئی دہلی، سرسید نمبر، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

جد و جہد آزادی اور علمائے صادق پور

میں ایسے حریت پسند، انگریز دشمن اور مخلص وطن پرستوں کی جماعت کا ذکر کرنا چاہوں گا جنہیں تاریخ کے صفحات نے نمایاں جگہ نہیں دی کیوں کہ تاریخ کی یہ کمزوری بہت پرانی ہے کہ وہ صرف فاتحین کے نام ہی روشن کرتی رہی ہے بالخصوص ایسے دور میں کہ قلم دشمنوں کے ہاتھ میں ہو یا اہل قلم دشمنوں سے مرعوب ہو لیکن کیا آزاد ہندوستان کے حقیقت شناس مورخ بھی اسی ''دشمن نوازی'' کی تقلید کریں گے......! جی ہاں۔ تقریباً ڈیڑھ صدیوں پر محیط ان کے شاندر کارناموں کو بھلا دیا گیا جس کا پہلا سرا شاہ ولی اللہ تو آخری سرا جمعیۃ العلماء سے ملتا ہے۔ درمیان میں شاہ عبد العزیز کی تربیت گاہ، سید احمد شہید و اسمٰعیل شہیدؒ کا تمام ہندوستان میں جہاد و حریت کی روح پھونکتے ہوئے خود اپنی روحوں کو ملک و وطن کی بھینٹ چڑھا دینا، علماء صادق پور کے مجاہدانہ کارنامے، انقلاب ۱۸۵۷ء میں علماء کا کردار، تحریک ریشمی رومال کا حیران کن نیٹ ورک اور ملک کی آزادی لیکن بٹوارے کی مخالفت جمعیۃ العلماء کی جد و جہد اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ ایک بہت وسیع موضوع ہے۔ میں نے اس مقالے میں صرف علماء صادق پور کے مجاہدانہ کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت سید احمد کی شہادت کے بعد تحریک کے دو مرکز ہو گئے۔ دہلی کے قدیم مرکز کے علاوہ دوسرا مرکز، صادق پور (پٹنہ) میں قائم ہوا۔ اس مرکز کے بانی مولانا ولایت علی صاحب ہیں۔ ان کے دادا احمد علی، اروَلی، ضلع، گیا'' (بہار) کے قاضی تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ گئے جہاں

معقولات کے مشہور عالم مولانا محمد شرف صاحب کے حلقہ درس میں داخل ہوئے۔ لکھنؤ میں ہی سید احمد شہید سے ملاقات ہوئی اور سید صاحب سے گفتگو کے بعد ان کے تحریک سے متاثر ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے گھر لوٹے اور تحریک کا مرکز قائم کر کے کام کرنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد سید احمد شہید نے کابل میں سفارت کے لئے انہیں بھیجا۔ سید صاحب کی تحریک شمالی ہند میں متعارف ہو چکی تھی۔ جنوبی ہند میں فضا ہموار کرنے کی غرض سے مولانا ولایت علی کو حیدآباد روانہ کیا۔ اس وقت نواب ناصر الدولہ کی حکومت تھی۔ مولانا ولایت علی نے جب اصلاحی کام شروع کیا تو انگریز نواز حکومت کو یہ کب برداشت ہوتا۔ دو سال کے اندر ہی ولایت علی صاحب کو ریاست سے نکال دیا گیا۔ ان کی حمایت کرنے کے جرم میں ناصر الدولہ کے بڑے بھائی مبارز الدولہ کو بھی جلاوطنی نصیب ہوئی اور قید میں ہی وفات پائی۔

مولانا ولایت علی حیدر آباد سے نکالے جانے کے بعد ممبئی چلے گئے۔ وہاں پہنچے ہی تھے کہ معرکہ بلاکوٹ میں حضرت سید احمد اور مولانا اسمٰعیل صاحب کی شہادت کی خبر ملی۔ اس واقعہ نے انہیں مایوس ہونے کے بجائے ایک نیا حوصلہ اور ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی۔ اس عرصہ میں ان کے والد ماجد مولانا فتح علی کا سانحہ ارتحال پیش آیا۔ وقت کے تقاضوں پر لبیک کہتے ہوئے فوراً پٹنہ روانہ ہو کر تحریک کی از سر نو تشکیل دی جس کا مرکز صادق پور قرار پایا۔ اس تحریک کو عام کرنے کی غرض سے مولانا سید محمد علی رام پوری کو مدراس اپنے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی کو بنگال اور مولانا شاہ احمد حسین کو بہار میں رکھا۔ یہ حضرات ہر چھوٹی بڑی آبادیوں، بستیوں اور گاؤں میں پھیل جاتے۔ وعظ و پند کا طریقہ اپنا کر اصل مدعا رکھتے۔ ضرورت پڑنے پر عام فہم اور مختصر رسالے بھی قلم بند کر کے تقسیم کئے جاتے۔ ایسے رسائل کی تعداد تقریباً ۱۰۰ ہو گی۔ یہ رسالے نظم اور نثر دونوں صورتوں میں پائے جاتے۔ ان میں اکثر تو زمانے کی نذر ہو گئے۔ ایک منظوم رسالہ ''پیش گوئی شاہ نعمت اللہ'' نام سے آج تک مشہور ہے۔ اس کے اکثر اشعار لوگوں کی زبان پر ہے۔ ولیم ولسن ہنٹر لکھتا ہے:

''انگریزوں کے خلاف جدوجہد پر نظم و نثر کی مختصر سے مختصر کیفیت بھی

لکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ اس جماعت
نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریز حکومت کے زوال کی پیشین
گوئیوں سے پر ہے۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ہنٹر: ص ۹۹)

دو سال کے اندر اندر تحریک میں جب استحکام پیدا ہو چلا تو مولانا ولایت علی صادق پور سے بنگال روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر اپنے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی کو لے کر بحری راستے سے ممبئی کا رخ کیا پھر وہاں سے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ حج سے فراغت کے بعد یمن، نجد، مسقط اور حضر موت وغیرہ کا طویل سفر کرتے ہوئے ممبئی، کلکتہ اور پھر صادق پور پہنچے۔ اس طرح انہوں نے ان کڑیوں کو جوڑنے کا کام کیا جو حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد ٹوٹ چکے تھے۔ صادق پور پہنچ کر جماعت کو منظم کیا اور چند ارکان کا اضافہ بھی کیا۔ رفتہ رفتہ دس برسوں میں مجاہدین کی ایک طاقتور جماعت تیار ہو گئی۔ حالات اب اس بات پر مجبور کر رہے تھے کہ سید احمد شہید کے قائم کردہ مرکز کی جانب دوبارہ کوچ کیا جائے۔ اس کے لئے ایک موقع ہاتھ آ گیا جب بلاکوٹ کے رئیس ''ضامن شاہ'' نے جموں کے راجہ گلاب سنگھ کے خلاف مولانا ولایت علی سے مدد طلب کی۔ گلاب سنگھ انگریزوں کا وفادار اور وطن دشمن شخص تھا جس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب میں خانہ جنگی قتل عام، خونریز معرکے اور انگریزی سامراج میں صوبہ پنجاب کے الحاق کے لئے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مولانا ولایت علی مجاہدین کے دستہ کے ساتھ بلاکوٹ پہنچ گئے اور ۱۸۴۶ء میں گلاب سنگھ کو شکست دی۔ ایک دفعہ پھر سید احمد شہید کی یاد تازہ ہو گئی۔ مجاہدین نے علاقہ کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے کر امن و امان قائم کر دیا لیکن اقتدار کے لالچی اور خود غرض ضامن شاہ کو یہ کب برداشت تھا۔ اس نے انگریزوں سے ساز باز کر کے مجاہدین کے افسروں اور پولس کے ذمہ داروں کو شہید کرا دیا۔ اس واقعہ کے بعد مولانا ولایت علی نے مجاہدین کے ساتھ 'سوات' کا رخ کیا۔ راستہ میں انگریزی فوج نے محاصرہ کر کے صادق پور جانے پر مجبور کیا اور دو سال وطن سے نہ نکلنے پر انگریزوں سے معاہدہ ہوا۔ دو سال مکمل ہوتے ہی آپ متعلقین کے ساتھ جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے ڈیڑھ سال کے عرصہ میں دہلی پہنچے۔ مسجد فتح پوری کے قریب مکان لے کر قیام کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے قلعہ میں آنے کی دعوت دی۔ وہاں مجمع عام میں خطاب کیا۔ مومن خاں مومن بھی حلقہ ارادات میں شامل ہوئے

۔ کچھ عرصہ دہلی میں قیام کر کے پنجاب ہوتے ہوئے یاغستان پہنچے اور ستھانہ کے والی سید اکبر شاہ نے اپنے لشکر کے ساتھ استقبال کیا۔ یہ وہی ستھانہ ہے جو سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی آج تک مجاہدین کا وفادار رہا ہے۔ یہاں پہنچنے کے کچھ عرصہ کے اندر ہی ۱۸۵۲ء میں مولانا ولایت علی کا انتقال ہو گیا۔

مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی نے اب کمان سنبھالی۔ یہ وہی عنایت علی صاحب ہیں جنہوں نے بنگال میں رہ کر ایسی فضا ہموار کر دی تھی کہ چالیس سال تک بنگال سے رسد اور افراد کی کمک مجاہدین تک پہنچتی رہی۔ اب پہلی مرتبہ انگریزی فوجوں سے براہ راست مجاہدین کی لڑائی ہو رہی تھی۔ اس موقع پر جبکہ مولانا عنایت علی سرحد میں انگریزی فوج سے لڑ رہے تھے، ۱۸۵۷ء کا واقعہ رونما ہوا اور پورا شمالی ہندوستان اس کی لپیٹ میں تھا۔ داد خاں کی مدد کے لئے انگریزوں نے اپنی فوج روانہ کیا۔ ہنٹر اس واقعہ پر انتہائی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''سرحد پر مجنونیوں کے کیمپ کو روپیہ اور آدمی پہنچانے کا جو باغیانہ نظام قائم تھا اس کی طرف سے انگریزی حکومت اب زیادہ دیر تک آنکھ بند نہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۸۵۲ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے ...... اس اثنا میں ستھانہ کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو ابھارتا رہتا تھا نہایت عقلمندی سے ہماری فوج کے ساتھ براہ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا لیکن ۱۸۵۷ء میں انہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بنیاد ڈالی جس میں قبیلہ یوسف زئی اور قبیلہ پنج تار نے خاص طور پر حصہ لیا۔ اب زیادہ دیر نہیں کی جاسکتی تھی چنانچہ سر سڈنی کوٹن پانچ ہزار فوج کی معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گیا۔ بڑی دقت کے بعد جنرل سڈنی کوٹن کی فوج نے باغی اتحادیوں کے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا۔ ان کے دو اہم قلعوں کو مسمار اور ستھانہ کی

باغی نو آبادی کو بالکل تہ و بالا کر دیا لیکن مجاہدین نے صرف یہ کیا کہ مہابن پہاڑیوں کی دشوار گزار وادیوں میں پیچھے ہٹ گئے اور اپنی قوت کو ذرا بھی ضعف نہ پہنچنے دیا۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ہنٹر، ص ۴۰)

علماء صادق پور کے لئے یہ مشکل ترین جنگ تھی جس کا اتنی تفصیل سے ہنٹر نے ذکر کیا ہے، مولانا عنایت علی کی قیادت میں لڑی جانے والی یہ آخری لڑائی تھی۔ عین اسی موقع پر ۱۸۵۷ء کا انقلاب پیش آگیا جس سے ان مجاہدین کی رسد کے راستے مسدود ہوگئے۔ ان حضرات پر کیا گزری، چشم دید گواہ مولانا عبدالرحیم نے ''الدرالمنثور'' میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''۱۸۵۷ء کے انقلاب کی وجہ سے راستے پرخطر تھے۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ اور کیوں کر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لئے کوئی سامان کیا جاسکتا تھا۔ مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کر دی۔ درختوں کی کونپلوں اور پتیوں سے اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلودہ ہونے لگیں۔''

(الدرالمنثور: ص ۱۳۸، مولانا عبدالرحیم)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کن حالات میں ان علماء صادق پور نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ یہ چند برس اس علاقہ میں انگریزوں کے لئے مشکل ترین تھے کیوں کہ ہنٹر کے مطابق انہیں سولہ (۱۶) فوجی مہمیں سر کرنی پڑیں جس میں باقاعدہ فوج کی تعداد ۶۰ ہزار تک تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ ہے۔ اس جنگی مہم کے بعد مولانا عنایت علی کا انتقال ۱۸۵۸ء میں ہوگیا۔ مولانا نوراللہ نے قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔ ان کا انتقال بھی دو برسوں میں ہوگیا۔ لیکن اس دوران اپنے تدبر سے دوبارہ تحریک میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے بعد ۱۸۶۱ء میں میر مقصود علی کے زمانہ امارت میں انگریزی عملداری میں چھاپے مارنے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بقول ہنٹر بے وفا ہندوستانی رعایا باغی کیمپ میں متواتر جمع ہوتی ہی۔ حتی کہ ۱۸۶۲ء میں ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ پنجاب گورنمنٹ ایک دوسری جنگ کا مشورہ دینے پر مجبور ہوگئی۔

۱۸۶۲ء میں میر مقصود علی کے انتقال کے بعد مولانا ولایت علی کے بڑے صاحبزادے مولانا

عبداللہ صادق پوری نے ۱۹۰۲ء میں اپنی وفات تک تقریباً چالیس سال اس تحریک کو زندہ رکھا۔ اپریل ۱۸۶۳ء سے ان کی قیادت میں انگریزی علاقوں پر حملے شروع کردئے گئے گھبراہٹ میں ہنٹر کہتا ہے کہ اس وقت ہم تقریباً انہی حالات سے دوچار تھے جو ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۱ء کے دوران پیدا ہوگئے تھے۔ اس کا اشارہ سید احمد شہید کی طرف تھا۔ ۱۸۶۳ء کی اس جنگ میں جسے درہ امبیلا میں لڑنے کی بنا پر 'جنگ امبیلا' کا نام دیا گیا، سیر نیول چیمبرلین کی سرکردگی میں ۹ ہزار برطانوی فوج نے حصہ لیا تھا۔ ہنٹر نے بڑی تفصیل سے جذباتی انداز میں جنگ کی ایک ایک حرکت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق تمام برطانوی فوج ہفتوں ایک ہی درّہ میں دبکی بیٹھی رہی۔ وہ براہ راست ٹکرانے سے کتراتے رہے تھے کیوں کہ ماضی کا تلخ تجربہ انہیں تھا۔ بالآخر اپنی وہی پرانی چال ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کا استعمال کیا۔ سرحدی قبائل اور مجاہدین کو آپس میں متنفر کردیا۔ قبائل کی یہ کمزوری ہے کہ ان کی دوستی ناپائیدار ہوتی ہے چنانچہ سید احمد شہید کے ساتھ جو پیش آیا تھا وہی مولانا عبداللہ کے ساتھ پیش آیا۔ میدان گرچہ انگریزوں کے ہاتھ میں رہا لیکن زبردست جانی نقصان ہوا۔ مولانا جعفر تھانیسری کا کہنا ہے:

> ''امبیلے کی گھاٹی میں جاکر فوج سرکاری کو بہت تکلیف ہوئی ...... خود جنرل چمبرلین مجروح شدید ہوئے۔ قریب سات ہزار کے کشت و خون کی نوبت پہنچی۔ تمام پنجاب کی چھاؤنیوں سے فوج کھینچ کر سرحد بھیج دی گئی''۔ (تواریخ عجیب عرف کالا پانی: اقبال اکیڈمی لاہور: ص ۸)

اور ہنٹر سے بھی اس بارے میں کچھ تفصیل سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے:

> ''جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑ تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں ...... اسکے علاوہ سردی لگ جانے یا کسی بیماری سے ہلاک ہونے والوں کی غیر معمولی تعداد تھی۔ پنجاب گورنمنٹ نے اس مہم کے نتائج بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس سے پہلے اور کسی موقع پر بھی کوہستان میں اس قدر شدید اور دیرپا جنگ نہیں ہوئی۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص: ۵۹)

اس جنگ کا انگریزوں پر اتنا اثر ہوا کہ تقریباً دس برسوں تک بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہا۔ املاک کو ضبط کرلیا گیا۔ اخباروں میں اکثر اس واقع کا چرچا رہتا تھا۔ لوگ ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ایک بڑی تعداد مارے جانے کے خوف سے بیرون ملک جابسی۔ امبیلا کی جنگ مجاہدین کی آخری بڑی جنگ تھی اس کے بعد مولانا عبداللہ صادق پوری نے ۱۸۶۸ء میں ایک جنگ اور لڑی ہے جو چھ ماہ تک جاری رہی لیکن اس بار انگریزوں نے مجاہدین کو بالکل ختم کرنے کا عہد کرلیا۔ بالآخر وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ حالانکہ مولانا عبداللہ صادق پوری کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالکریم نے 1915ء تک پھر مولانا عبداللہ کے پوتے نعمت اللہ ورحمت اللہ غازی یکے بعد دیگرے تحریک کو زندہ کیے رہے۔ بقول ہنٹر:

> ''یہ کئی دفعہ انگریزی فوجوں کے ہاتھوں تباہ برباد ہو چکے ہیں لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک زندہ ہیں...... جن چنگاریوں کو ہم نے خاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اس بجھی ہوئی راکھ سے ایک دفعہ پھر شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص:۶۲)

اگرچہ چنگاریاں رہ رہ کر دھواں دیتی رہیں مگر ملک گیر تحریک کا نظام معطل ہو گیا اور اس کی کل ہند حیثیت ایک طرح سے ختم ہوگئی۔ آفریں ہے علماء صادق پور پر ان کے حوصلوں کی داد دیجئے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک انگریزوں سے مسلسل لڑکر ان کی قوت کو کمزور کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ انگریزوں سے ٹکر لینے کیلئے اب رفتہ رفتہ علماء کی ایک دوسری تحریک بھی ابھر رہی تھی جسے تاریخ نے ''تحریک ریشمی رومال'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد میں علماء کے جذبات کبھی سرد نہیں ہوئے، ایک تحریک کو کچل دینے کے بعد دوسری تحریک زندہ ہو جاتی۔ ''تحریک ریشمی رومال'' پر بھی جب شکنجہ کسنے کی کوشش کی گئی تو حکمت عملی بدل لی۔ اب پرامن طریقہ سے ملک کو آزاد کرانے کا راستہ اپنایا گیا۔ اس طرح انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ مل کر جمعیۃ العلماء نے ۱۹۴۷ء تک جدوجہد کو جاری رکھا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ تمام واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

(شش ماہی رسالہ ہماری آواز میرٹھ جنوری تا جون ۲۰۰۸ء)

برطانوی ہند کی سیاست میں شبلی کا موقف

۱۸۵۷ کا انقلاب والا سال شبلی کی پیدائش کا سال ہے۔ ان کے سنِ شعور کو پہنچتے پہنچتے ہندوستانی اقتدار، سماج، تعلیم اور سیاست میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔ فکری اعتبار سے قدیم وجدید کی کشمکش جاری تھی۔ جس کی لپیٹ میں مذہب، معاشرہ اور تعلیم تینوں تھے۔ شبلی کا خاندان اقتدار کا پاسدار تھا جس بنا پر ان کی تعلیم مروجہ طریقے سے عربی مدرسہ میں ہوئی اس کے علاوہ نجی طور پر مولانا فاروق چڑیا کوٹی، مولوی عبدالحئی فرنگی محلی، مولوی ارشاد حسین مجددی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے بھی کسب فیض حاصل کیا۔ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۶ء تک محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ یہ ان کی زندگی کا زرّیں دور تھا۔ یہاں انہوں نے پروفیسر آرنلڈ سے علم تاریخ اور سیرت نگاری کے جدید سائنٹفک اصولوں کے ساتھ ساتھ فرنچ زبان بھی سیکھی اور خود پروفیسر موصوف کو عربی زبان وادب سے واقف کرایا۔ پروفیسر آرنلڈ جب یورپ جانے لگے تو ان کے ساتھ ہی مشرق وسطی اور ترکی کا سفر کیا۔ میرے خیال میں برطانیہ کے سفر نے جس طرح سرسید کے خیالات وافکار پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اسی طرح شبلی کے ان بیرون ملک کے اسفار نے ان کے سیاسی موقف میں تبدیلی تو نہیں استحکام ضرور عطا کیا اور سرسید کے برعکس ان کی انگریز دشمنی میں اضافہ کا باعث ہوا۔ کیونکہ ان ممالک میں انہوں نے یورپی قوموں کے ظلم و بربریت کو دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عمر میں سرسید سے چالیس برس چھوٹے ہونے کے باوجود شبلی اپنا علیٰحدہ سیاسی موقف رکھتے تھے۔ حالانکہ سرسید کے نامور رفقا میں شبلی کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے باوجود

ایسا نہیں ہے کہ شبلی سرسید کا احترام نہیں کرتے تھے۔ ایک خط میں شبلی نے اپنے اختلاف کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

> ''وہ (شبلی) رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا، اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں'' (معارف، اعظم گڈھ نومبر ۱۹۲۳ء)

واضح رہے کہ یہ اختلافات ملک وقوم کی فلاح و بہبودی کے طریقۂ کار پر تھا اس میں نہ تو ذاتی مفاد اور نہ ہی آپسی چپقلش کو دخل ہوتا۔ شبلی کانگریس کو ہندوستانی سیاست میں بہتر نمائندہ جماعت سمجھتے تھے جبکہ سرسید کانگریس کی کھل کر مذمت کرتے۔ شبلی کا یہ خیال تھا کہ پرنسپل بیک (Beck) سے متاثر ہو کر سیر سید کانگریس کی مخالفت کرتے تھے ان کے خیال کی دیگر حضرات نے بھی تائید کی ہے۔ اس سلسلے میں شبلی نے سرسید پر ایک قطعہ کہا جو بڑا مشہور ہوا۔

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روشِ سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف
ان کی ہر بات میں آورد تھی ، آمد تو نہ تھی

اگر دیکھا جائے تو شبلی نے عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر ان کا موقف واضح، متوازن اور مدلل تھا۔ ایک جانب وہ پین اسلامزم یعنی عالمگیر اسلامی اخوت کی بات کرتے ہیں تو دوسری جانب ملکی سطح پر دوقومی نظریے کے بجائے ہندو مسلم یکجہتی اور وطن پرستی پر زور دیتے ہیں۔ ایک طرف وہ جنگ بلقان میں ترکوں کے دکھ درد میں برابر کے شریک نظر آتے ہیں تو دوسری طرف مسلم لیگ کے خلاف کانگریس کی حمایت کرتے ہیں۔ کانگریس کی حمایت کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ شبلی جمہوری نظام حکومت کو سب سے بہتر تصور کرتے تھے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران متعدد بار اس سلسلہ میں اظہار خیال کیا حالانکہ اس وقت جمہوریت پر باتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ کالج میں ایک موقع پر انہوں نے ''اسلام بحیثیت ایک مکمل مذہب: اسلام کی بہترین جمہورت'' کے موضوع پر لیکچر دیا

جس میں انہوں نے ثابت کیا کہ جمہوریت کی بنیاد مساوات پر ہے اور اسلام سے زیادہ مساوات کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا اسلام بہترین جمہوری نظام فراہم کرتا ہے ۱۹۰۸ء میں جب سلطنت عثمانیہ کو جمہوری حکومت قرار دیا گیا تو شبلی بھی اس تبدیلی سے بہت خوش ہوئے اپنی نجی محفلوں میں وہ ترکوں کی بہادری کی داستانیں بیان کرتے۔

ہندوستانی سیاست میں وہ گوپال کرشن گوکھلے کو ایک کامیاب رہنما مانتے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون جو ۱۸/ مارچ ۱۹۱۲ء کو مسلم گزٹ لکھنؤ میں شائع ہوا لکھتے ہیں:

> ''لیڈروں کے لئے وہ شخص درکار ہے جو مسٹر گوکھلے کی طرح خطاب، جائداد، دولت اور تمام تعلقات سے آزاد ہو۔ پر جوش اور دلیر ہو اس کے ساتھ پالیٹکس کا ماہر ہو اور پولیٹکل لٹریچر کا مدتوں مطالعہ کر چکا ہو۔ اگر قوم میں ایسے شخص موجود نہیں ہیں تو لیڈری کے تخت کو اور بھی چند روز خالی رکھنا اور واقعی تخت نشین کا انتظار کرنا چاہئے۔''

شبلی، گوکھلے کو اس لئے رہنما مانتے ہیں کہ وہ خطاب، جائداد اور دولت سے بے نیاز ہیں۔ پُرجوش اور دلیر ہیں جبکہ اس کے برعکس مسلم لیگ کے رہنما حکومت کی خوشامد کرتے ہیں یہ پارٹی نوابوں اور زمینداروں کی نمائندگی کرتی ہے۔ عوام سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ برطانوی حکومت کی حمایت کرنا اور ان کی نظروں میں وفادار رہنا لیگ کا ایک بنیادی مقصد تھا لہٰذا شبلی کو کب یہ گوارہ تھا انہوں نے اس کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ کل سات نظمیں اس کی نذر کیں۔ کئی مضامین لکھے۔ ایک نظم میں کہتے ہیں:

> لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
> ملک میں غلغلہ ہے' شور ہے' کہرام بھی ہے
> ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
> نظر لطف رئیسانِ خوش انجام بھی ہے

ایک دوسری نظم میں کہتے ہیں:

جناب بیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت
کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیے
کلیم طور پہ کرتے تھے عرض قوم کا حال
تو آپ شملہ پہ کچھ حال قوم کا کہیے
عدالتوں کی پریشانیاں بیان کیجئے
فسانہ ستم و جورِ ناروا کہیے
برادرانِ وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
کبھی تو آپ بھی افسانہ جفا کہیے
کبھی تو ردّ و قدح کی بھی کیجئے جرأت
جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہیے
نہ ہو سکے تو اشاروں میں کیجئے اظہار
وگر نہ لطف تو یہ ہے کہ بر ملا کہیے
جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا
مجھے تو خُو ہے کہ کچھ کہو بجا کہیے

شبلی نے لکھنؤ سے نکلنے والے ''مسلم گزٹ'' میں ایک طویل مضمون ''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ'' عنوان سے ۱۹۱۲ء میں لکھا۔ چار قسطوں پر مشتمل اس مضمون کے ذریعہ علامہ شبلی کے سیاسی نظریات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس تحریر میں انہوں نے مسلم لیگ سے سوال کیا ہے کہ ''اس کا نظام ترکیبی کیا ہے؟ کیا ایک معزز رئیس، ایک بڑا زمیندار، ایک حکام رس دولت مند کسی تحریک کے لئے اپنی جائداد، اپنی حکام رسی، اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارہ کر سکتا ہے۔''

اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''آج مسلم لیگ گو شرم مٹانے کے لئے کبھی کبھی عام ملکی مقاصد میں بھی کسی کو اپنی کارروائی میں داخل کر لیتی ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ

اس کے چہرہ کا مستعار غازہ ہے۔ رات دن جو شور مچایا جاتا ہے، وہ
صرف یہ ہے کہ ہندو ہم کو دبالتے ہیں۔ اس لئے ہم کو اپنا تحفظ کر لینا
چاہیئے۔ مسلم لیگ کا اصل صرف یہ ہے، باقی جو کچھ ہے موقع اور محل کے
لحاظ سے تصویر میں کوئی خاص رنگ بھر دیا جاتا ہے۔''

بیسویں صدی کے شروع میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جس سے ہندوستانی مسلمان کانگریس سے قریب تر ہوتے گئے مثلاً جنگ طرابلس و بلقان، خلافت تحریک اور کانپور کی مسجد کا سانحہ وغیرہ دیکھ کر لیگ نے بھی اپنا چہرہ بدل لیا اور اس نے ایک خود مختار حکومت کا مطالبہ شروع کر دیا لیکن اس کے ساتھ ایک لفظ 'سوٹ ایبل' استعمال کیا یعنی ہندوستان کے حالات کے مناسب خود مختار حکومت یہ لفظ ذو معنی تھا۔ اس پر شبلی نے کہا:

میں نے یہ سوٹ ابل کی جو لگائی ہے قید
یہ عجیب نکتہ آئین جہاں داری ہے
فن اِنشا و بلاغت کا بھی رکھا ہے لحاظ
کوئی کیا جانے کہ کیا اس میں فسوں کاری ہے
میں نے اس لفظ میں رکھے ہیں ہزاروں پہلو
ایک جملہ ہے مگر لاکھ پہ بھی بھاری ہے
یاں تلک کانگریس کا بھی نہ پہنچا تھا خیال
نہ سمجھے گا کہ یہ بھی کوئی قماری ہے

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلم لیگ کی مخالفت میں شبلی نے نظم اور نثر دونوں میں جس طرح بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ ہندوستان کی سیاست میں ایک اہم واقعہ تقسیم بنگال کا ہے ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم اور ۱۹۱۱ء میں اسے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ اس وقعہ پر مسلمان خود منقسم تھے۔ تقسیم پر اول برادرانِ وطن کی جانب سے احتجاج ہوا کیونکہ گورنر جنرل لارڈ کرزن نے ۱۱/مارچ ۱۹۰۵ء کو ڈھاکہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''تقسیم بنگال سے ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ

بنگال کی گورنمنٹ کے انتظامی بار کو ہلکا کیا جائے بلکہ اسلامی صوبہ بنانا تھا جس میں مسلمانوں کا غلبہ ہو۔'' ۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم کی منسوخی پر نواب وقارالملک نے اسے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی قرار دیا۔ شبلی نے بھی حکومت کے اس اقدام کی مذمت کی۔ ساتھ ہی اسے مسلمانوں کی غلط سیاست کا شاخسانہ قرار دیا۔

اسی دور کا ایک اہم واقعہ جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا مسجد کانپور کا سانحہ ہے۔ ۱۹۱۲ء میں کانپور کے محلہ مچھلی بازار میں سڑک کی توسیع کے دوران انتظامیہ نے ایک مسجد کے وضو خانہ کو منہدم کر دیا مسلمانوں نے اس کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا۔ اس احتجاج کے دوران فوج نے گولیاں چلادیں، بڑی تعداد میں لوگ جن میں بچے بھی شامل تھے جاں بحق ہو گئے۔ یہ سانحہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور آزادیٔ ہند کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس پر صحافیوں نے اداریے اور مضامین لکھے، شعرا نے نظمیں کہیں، مقرروں نے تقریریں کیں۔ شبلی جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھے تھے، نکل کر جوشیلی تقریریں کیں اور ولولہ انگیز نظمیں پڑھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ اس واقعہ پر انہوں نے آٹھ نظمیں کہیں۔ چار مصرعے ''خون کے چند قطرے'' عنوان سے جو لکھے ہیں دیکھے:

اگر چہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں
کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

ایک دوسری نظم ''علمائے زندانی'' کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

مساجد کی حفاظت کے لئے پولس کی حاجت ہے
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے
عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہراہ سے یہ صدا آئے
مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانہ کی ضرورت ہے

پہنائی جارہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجادِ عالی کی وراثت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے
شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہے آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

علامہ شبلی ایک مورخ بھی تھے، انہیں اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون سے حد درجہ دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی آخری خلافت، خلافت عثمانیہ ترکی کو تمام عالم اسلام کا نجات دہندہ سمجھتے تھے، لیکن یورپ کے اس 'مردِ بیمار' کو مغربی طاقتوں نے جنگوں اور قرضوں کے ذریعہ مرض الوفات میں مبتلا کر دیا تھا بالآخر اس کا خاتمہ بالشر ہوگیا۔ اقبالؔ کی زبان میں

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

بہر حال ان ترکوں کے ساتھ شبلی کا والہانہ لگاؤ تھا صدیوں سے مشرقی یورپ کا اکثر حصہ خلافت عثمانیہ کے زیر انتظام تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے ہی یورپ مسلسل ترکی پر دباؤ بنا کر خلافت کے حصے بخرے کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ۱۸۷۶ء کی روس وترکی کی جنگ میں ہندوستانی مسلمانوں نے ترکوں کی اعانت کے لئے رقم اکٹھا کی۔ شبلی نے بھی اپنے شہر سے کئی ہزار روپے ترکی کے سفیر کے ذریعہ بھیجے۔ بقول سید سلیمان ندوی "ان کی بہت کم مجلس ترکوں کے فضائل ومناقب اور دلچسپ قصوں کے بیان سے خالی ہوتی تھی اور جب وہ بیان کرنے پر آتے تھے بلبل ہزار داستان بن جاتے تھے۔" (حیات شبلی ص ۸۹۰)

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ اس سے ساری دنیا کے مسلمان یورپ کے خلاف ہوگئے، ابھی اس واقعہ سے مسلمانوں کے زخم ہرے تھے کہ ۱۹۱۳ء میں بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا۔ علامہ شبلی جنہیں ترکوں سے بے پناہ محبت تھی کب چپ بیٹھنے والے

تھے۔ایک طویل نظم ''شہر آشوب اسلام'' کے نام سے لکھ ڈالی جو بھی اس نظم کو سنتا آٹھ آٹھ آنسو روتا چند اشعار ملاحظہ ہو۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جاچکا ،فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا گرمی محفل کے سامان چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خوں سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیروان کب تک

یہ نظم شبلی نے لکھنؤ کے ایک جلسہ میں پڑھی تھی اس وقت خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔اس خون آشام جنگ میں ترکوں کا زبردست نقصان ہوا۔ ہندوستانی عوام نے ترکی کو مالی امداد کے علاوہ طبی امداد بھی پہنچائی، چنانچہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ایک طبی وفد جنگ کے محاذ پر بھیجا گیا۔ان کے ہمراہ شعیب قریشی ، چودھری خلیق الزماں ،عبدالرحمٰن صدیقی اور

عبدالعزیز انصاری وغیرہ موجود تھے۔ ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر نعیم انصاری برطانیہ سے سیدھے قسطنطنیہ پہنچے تاریخ میں ترکوں کی خدمت کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کا اپنی قسم کا یہ پہلا کارنامہ تھا جنگ کے اختتام پر ڈاکٹر انصاری جب اپنا یہ طبی وفد لے کر ہندوستان واپس ہوئے تو علامہ شبلی اس وقت ممبئی میں تھے۔ اس وفد کے استقبال وخیر مقدم کے لئے ممبئی میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں علامہ نے ایک پُر درد نظم پڑھی۔ چند اشعار دیکھئے:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیرت سے ممبران وفد انصاری
ہزاروں کوس جاکر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا درد اسلامی یہی تھی رسم غمخواری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کر پہنچے پے یاری
تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری
تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستان والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلادینا
بلاد مغربی کے یہ نئے قانون بھی دیکھے ہیں
تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں
تمہاری چشم عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتا ہے
کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں
سہارا ہے اگر امیر کا اب بھی کوئی باقی

تو تم نے وہ رموزِ قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑہ غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں
دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول عام یزدانی
تو اب دستِ دعا ہے اور شبلی نعمانی

مذکورہ بالا چند ملکی وملی مسائل پر شبلی کے موقف کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں حیرت انگیز صداقت نظر آتی ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی فراست اور بصیرت والی نگاہوں سے انہوں نے مستقبل کے ہندوستان کو دیکھ لیا تھا اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ شبلی نے عملی سیاست میں حصہ نہ لینے کے باوجود، کیونکہ اپنے علمی کاموں سے فرصت ہی کب تھی، ایک ایسے شخص کی تربیت کی جو اس موقف کو لے کر کھڑا ہوا اور کئی دہوں تک ہندوستان کی سیاست پر چھایا رہا کئی برسوں تک کانگریس کی قیادت اس کے ہاتھ میں رہی اور جدید ہندوستان کے معماروں میں بھی اس کا بڑا نام ہے میری مراد ابوالکلام آزاد سے ہے۔ انہیں لکھنؤ اپنے ساتھ لائے جبکہ خط وکتابت کا سلسلہ ۱۹۰۵ء سے ہی جاری تھا۔ الہلال والبلاغ کے مشن اور اس کی شہرت سے قبل مولانا آزاد کی الندوہ سے وابستگی کو ہمیں نہیں بھولنا چاہئے۔ علامہ شبلی کے وطن پرستی اور کانگریس کی پرزور حمایت کو ایک طرف ابوالکلام آزاد اور جمعیۃ العلماء ہند نے قبول کرتے ہوئے اسے فروغ بخشا تو دوسری جانب پین اسلامزم کے نظریہ کی علامہ اقبال نے حمایت کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اقبال نے براہ راست شبلی کے اثرات قبول کیے کیونکہ اقبال خود عبقری شخصیت کے مالک تھے جن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اقبال سے پہلے شبلی نے ملت اسلامی کے درد کو سمجھا۔ بہرحال آزادی سے قبل ہندوستان کی سیاست اور اس کے مختلف دھارے، پھر آزادی، تقسیم اور ملک کی تعمیر نو کی جب بھی بات آئے گی تو ہمیں شبلی ضرور یاد آئیں گے اور ان کے اٹل سیاسی موقف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

'نوائے ادب' سہ ماہی تحقیقی مجلّہ'
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ 'ممبئی' جولائی تا ستمبر ۲۰۰۹ء

منشی ذکاء اللہ "مقالاتِ گارساں دتاسی" کے آئینہ میں

منشی ذکاء اللہ یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان مغل شہزادوں کی اتالیقی پر مقرر تھا۔ ذکاء اللہ پر ان کے دادا حافظ محمد بقاء اللہ کی تربیت کا زیادہ اثر تھا۔ ان کے والد حافظ محمد ثناء اللہ ایک انسان دوست اور دیندار شخص تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں یہ خاندان اُجڑ گیا اور جائیدادیں ضبط ہو گئیں۔ [1]

منشی ذکاء اللہ نے قدیم دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی، انگریزی سے خاطر خواہ رغبت نہیں تھی اس لئے ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، طبعیات اور عربی و فارسی میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوانا شروع کیا۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں متعدد انعامات اور تمغے حاصل کئے۔ مولوی امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر ان کے محبوب استاد تھے۔ رام چندر کی صحبت نے انہیں ریاضی کا ماہر بنا دیا۔ لہٰذا صرف سترہ سال کی عمر میں ریاضی پر ایک کامیاب کتاب تصنیف کر کے دہلی والوں میں تہلکہ مچا دیا اور صرف چار روز میں یہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ کالج میں ان کے بہت دوست تھے مگر دو کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک مولوی نذیر احمد دوسرے مولوی محمد حسین آزاد اور عجیب بات ہے کہ ان تینوں دوستوں کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ [2]

تعلیم سے فراغت کے بعد اول دہلی کالج میں بیس (۲۰) روپے ماہانہ پر ریاضی کے استاد مقرر ہوئے پھر آگرہ کالج میں اردو ادب کے استاد رہے سات سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۸۵۵ء میں بلند شہر و مراد آباد وغیرہ میں گیارہ سال تک ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے پھر

۱۸۶۶ء میں دہلی نارمل اسکول کے صدر مدرس ہوئے تین سال کے بعد ۱۸۶۹ء میں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں ورناکلر سائنس اینڈ لٹریچر کے استاد مقرر ہوئے۔ الہ آباد میں قیام کے دوران جدید علوم کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔ چنانچہ مختلف علوم کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کی تحریک چلائی ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابیں عرصہ تک الہ آباد و پنجاب یونیورسٹی میں شامل نصاب رہی ہیں۔ میور کالج سے خود ہی پنشن لے کر سبکدوش ہوئے۔ ۳۶ سال کی ملازمت پھر بعد کے ۲۴ سالوں تک تصنیف و تالیف اور ترجمہ کے کام میں مصروف رہے۔ چنانچہ ڈیڑھ سو سے زائد آپ کی کتابیں موجود ہیں۔ ۳

منشی ذکاءاللہ کا جس قدر تعارف ہونا چاہیے تھا سچ پوچھئے تو ویسا نہیں ہوا۔ معاصرین میں سی ایف اینڈریوز نے ''ذکاءاللہ آف دہلی'' نام سے انگریزی میں کتاب لکھی ہے مگر وہ بھی ذکاءاللہ کی پوری شخصیت کا آئینہ دار نہیں ہے۔ مشہور مستشرق ''گارساں دتاسی'' نے اپنے مقالات میں کہیں کہیں ذکاءاللہ کا ذکر کیا ہے جو نا کافی ہے۔ بہر حال میں ''مقالاتِ گارساں دتاسی'' کے حوالے سے اپنی بات کروں گا۔

فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے ۱۸۷۰ سے ۱۸۷۷ء کے درمیان سالانہ آٹھ لیکچر دیئے ہیں۔ یہ لیکچر (مقالات) ہندوستانی زبان سے متعلق ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے دو جلدوں میں اسے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر عزیز احمد اور اختر حسین رائے پوری نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

گارساں دتاسی نے کہنے کو تو ہندوستانی زبان پر یہ لیکچر بلکہ مقالات لکھے ہیں مگر اس کے متنوع موضوعات ہیں۔ بالعموم وہ مقالہ کا آغاز اردو ہندی قضیہ سے کرتا ہے پھر تفصیل سے ہندوستانی ادب، کتابوں اور اخباروں کی اشاعت، عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں ان کی کامیابیاں اور ناکامیاں، مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال، مختلف انجمنوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتا ہے۔ سرسید احمد خان کے کام اور فکر کا بڑی تفصیل سے وہ ذکر کرتا ہے۔ چونکہ اس کا زیادہ تر ماخذ ہندوستانی اخبارات ہیں اور لگتا ہے کہ علی گڑھ اخبار کو وہ بڑی توجہ سے پڑھتا تھا اسی لئے جا بجا اس اخبار کے حوالے سے وہ سر

سید کا ذکر بار بار کرتا ہے۔ حالانکہ اس میں سب کچھ سچ نہیں ہے۔

منشی ذکاءاللہ کا ذکر اس نے جہاں بھی کیا ہے ان کی تصنیفات کے حوالے سے ہی کیا ہے۔ پہلے اور دوسرے مقالے میں تو ذکر نہیں ہے البتہ تیسرا مقالہ ۱۸۷۲ء کا ہے اس میں منشی ذکاءاللہ کی کتاب "سلسلۃ العلوم" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "منشی ذکاءاللہ کے "سلسلۃ العلوم" کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا منشی ذکاءاللہ دہلی کے نارمل اسکول کے مدرس ہیں مسٹر کمپسن ناظم تعلیمات صوبہ جات شمال مغربی نے 'سلسلۃ العلوم' کی بہت تعریف کی ہے۔ ۴

اس کے بعد حاشیہ میں وہ لکھتا ہے کہ یہ منشی ذکاءاللہ وہی ہیں جنہوں نے شورش عظیم (یعنی انقلاب ۱۸۵۷ء) سے کچھ پہلے ۱۸۵۶ء میں میرے مضمون "اردو تذکروں پر تقریظ کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ پہلی جلد کا چوتھا مقالہ ۱۸۷۳ء کا ہے اس مقالے میں سرسید تحریک کی سائنٹفک سوسائٹی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ دراصل دہلی کالج کی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے کام کو سائنٹفک سوسائٹی نے آگے بڑھایا۔ منشی ذکاءاللہ نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ہی کیا۔ اسی طرح سائنٹفک سوسائٹی کے ادھورے کام کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے مکمل کیا۔ یہاں پر منشی ذکاءاللہ کے صاحبزادے منشی عنایت اللہ دہلوی نے اپنے والد کے مشن کے ساتھ دیا بہرحال اس مقالہ میں گارساں دتاسی لکھتا ہے۔

> "سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام منشی ذکاءاللہ نے حساب کی کتابوں کے ایک سلسلہ کا ترجمہ کیا ہے"۔ ۵

پانچواں مقالہ ۱۸۷۴ء کا ہے یہ دوسری جلد کا پہلا مقالہ ہے۔ منشی ذکاءاللہ اس وقت میور کالج الہ آباد میں تھے اور تاریخ ہندوستان پر کام کررہے تھے۔ گارساں دتاسی ۲۰ مارچ ۱۸۷۴ء کے علی گڑھ اخبار کے حوالے سے لکھتا ہے کہ۔

> "منشی ذکاءاللہ نے جو میور کالج الہ آباد میں پروفیسر ہیں تاریخ ہندوستان کے نام سے اردو میں ایک کتاب تالیف کی ہے اس کے شروع میں ملک

کا جغرافیہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اسے الفنسٹن' مل اور مارش مین
وغیرہ کی مستند تاریخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔" ۶

۱۸۷۵ء کے چھٹے مقالے میں منشی ذکاء اللہ کے اس کا کام کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اول ہندوستانی زبان پر بحث پھر انجمن پنجاب لاہور پر کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے اس کے بعد کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"منشی ذکاء اللہ خاں کی تاریخ ہندوستان پر پہلے بھی کچھ لکھا جا چکا ہے۔
اب اس کی دوسری جلد شائع ہوئی ہے۔" ۷

الطاف حسین حالی نے علی گڑھ اخبار میں اس پر تبصرہ کیا ہے اس کو گارساں دتاسی نے نقل کیا ہے کہ:

"پہلی جلد میں ہندو عہد کی داستان تھی پیش نظر کتاب مسلم عہد کے لئے وقف ہے اور تیسرے حصے میں برطانوی دور کی تاریخ ہوگی اب تک اردو زبان میں ہندوستان کی کوئی مکمل تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ مغربی مورخوں کی محنت نے ہندو عہد پر سے تاریکی کا پردہ اٹھا دیا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق فارسی میں اور انگریزوں کے بارے میں انگریزی میں بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ مؤلف نے ان سب کا مطالعہ کر کے یہ تاریخ لکھی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے وہ غیر ضروری چیزیں چھانٹ دی ہیں جو عام طور پر تاریخ وفسانے کی چیز بنا دیتی ہے۔ واقعات کی روشنی میں جو بات کھری نہیں اترتی اسے سختی سے قلم زد کر دیا ہے۔ مثلاً بازار کی افواہوں' نجومیوں کی کہانیوں اور شاعروں کے قصیدوں کے لئے ان کے ہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس طرح شادی بیاہ کی رسومات' میلے ٹھیلوں کا حال شکار کی تفصیل ایسی سب فضول چیزوں کو ترک کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ منشی ذکاء اللہ کا طریقہ کار یکسر مغربی ہے اور اس لحاظ سے وہ ایشیائی مورخوں میں سب سے آگے ہیں۔ ہر دور حکومت کے بیان میں انہوں نے اپنی ذاتی

رائے کو الگ رکھ کر انصاف پروری سے کام لیا ہے اور تعصب کو کہیں
پاس نہیں پھٹکنے دیا اور انداز تحریر سادہ اور دلچسپ ہے۔ اس ضخیم جلد
کو کہیں سے کھول کر پڑھئے یہی خوبی نظر آئے گی۔ مؤلف نے کسی
مورخ کا اثر قبول نہیں کیا۔ اپنے ضمیر کو رہنما بنایا ہے۔ ہندوستانی
حکمرانوں کے تذکرے میں مغربی نقادوں کی ستائش یا تنقیص کی کوئی
پروانہیں کی ہے۔ علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی نے الفنسٹن صاحب کی
تاریخ کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ لیکن منشی ذکاء اللہ کے کارنامے سے اس کا
کوئی مقابلہ نہیں۔ ۸

اس کے بعد الفنسٹن کی تاریخ کے ماخذ کو کمزور قرار دیتے ہوئے اس کے نقائص بیان کئے
ہیں پھر منشی ذکاء اللہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''ہمیں اس عالم کا احترام کرنا چاہیے جس نے انتہائی عرق ریزی کے
بعد ہمارے وطن کی مکمل تاریخ تیار کی اور ایک ایسی کمی پوری کی جو
ہمارے ادب کی بے مائیگی پر نکتہ چین تھی۔'' (ص:۱۴۱)

پھر ساتویں مقالہ میں جو ۱۸۷۶ء کا ہے منشی ذکاء اللہ کی کتاب جغرافیہ طبعی کا ذکر ملتا ہے۔
گارساں دتاسی لکھتا ہے۔

''مدرسۃ العلوم مسلمانان کے لئے منشی ذکاء اللہ نے جغرافیہ طبیعی لکھا ہے
اودھ اخبار نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے۔ مصنف کسی
تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے فرانسیسی ٹیلر صاحب کی مدد سے
میرے ایک مقالے ''اردو شاعری کے تذکرے'' کا ترجمہ ہندوستانی
میں کیا ہے''۔

گارساں دتاسی نے اپنے مقالے میں بہت سی کتابوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے جو کہ اتنی
اہمیت کی حامل نہیں ہیں کہ اس پر اتنا لکھا جائے مگر منشی ذکاء اللہ جن کی سینکڑوں کتابیں منظر عام پر
آچکی تھیں۔ ان کو اس نے نظر انداز کر دیا حالانکہ وہ یقیناً ان تصانیف سے واقف رہا ہوگا۔

حواشی:

۱۔ دہلی کالج اردو میگزین، قدیم دہلی کالج نمبر (دہلی: ۱۹۵۳ء) ص: ۱۳۹

۲۔ ایضاً ایضاً ص: ۱۴۳

۳۔ ایضاً ایضاً ص: ۱۴۵

۴۔ مقالات گارساں دتاسی جلد اول
(دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۳ء ص: ۱۰۱۔۲۰۰

۵۔ مقالات گارساں دتاسی جلد اول
(دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۳ء ص: ۳۲۷

۶۔ مقالات گارساں دتاسی جلد دوم
(دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۳ء ص: ۴۴

۷۔ ایضاً ایضاً ص: ۱۴۰

۸۔ ایضاً جلد دوم ص: ۱۴۱۔۱۴۰

۹۔ ایضاً جلد دوم ص: ۱۴۱

۱۰۔ ایضاً جلد دوم ص: ۲۴۱

☆☆☆

(۲۱/اپریل، ۲۰۱۱ء کو ذاکر حسین دہلی کالج کے نیشنل سیمنار میں پڑھا گیا مقالہ)

تبصرہ نگاری: چند معروضات

انسانی زندگی مختلف ادوار اور انقلابات سے گزرتی رہی ہے اِدھر دو تین صدیوں میں انسانی معاشرہ، علم، ذہن، ادب اور معیار زندگی میں جو تغیرات آئے ہیں اس سے قبل کے ہزاروں برسوں میں بھی دنیا نے وہ تماشا نہ دیکھا ہوگا۔ حجری عہد تانبے اور فولاد کا دور، صنعتی انقلاب اور سائنسی ایجادات سے گزر کر اب اطلاعاتی ٹکنالوجی کے عروج کا زمانہ ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے تو دنیا کا سارا منظر نامہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں موجود علوم وفنون کا تمام تر تو نہیں بیشتر حصہ انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب پبلیشنگ کی تجارت خسارے کی تجارت ہے اور کتابوں کی اب وہ اہمیت نہ رہی جو پہلے تھی میں اس بات سے قطعاً اتفاق نہیں کرتا۔ کتابوں کی اہمیت اور اس کا جو مقام انٹرنیٹ سے پہلے تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا بالکل ایسے ہی جیسے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے اور ضرورت بھی۔ چناں چہ دنیا میں جس طرح ہزاروں اخبارات روزانہ شائع ہو رہے ہیں اسی طرح ہر دن لاکھوں کتابیں پریس سے نکل رہی ہیں اب ان کتابوں کو قاری تک پہنچانے کا کام ایک تبصرہ نگار کرتا ہے۔

تبصرہ نگاری ایک بڑا کام ہے بلکہ یہ ایک ذمے داری ہے۔ تبصرہ نگار ہی قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کراتا ہے کہ کون سی کتاب اپنی پسند کے مطابق پڑھنی چاہیے اور کون سی نہیں۔ چناں چہ تبصرہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس چیز کا علم رکھتا ہو جس پر تبصرہ کر رہا ہے تبھی وہ کتاب اور قاری

کے درمیان رابطے کا کام کر سکتا ہے اور کتاب کا اس حد تک تعارف کرا دے کہ قاری اطمینان سے یہ فیصلہ کر سکے کہ یہ کتاب میرے لیے مفید ہے یا نہیں۔

عموماً تبصرہ اور تنقید کو گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے اور لوگ خیال کرتے ہیں کہ دونوں متبادل الفاظ ہیں یا یہ کہ تبصرہ اور تنقید میں ایک ہی بات کہی جاتی ہے حالاں کہ دونوں میں فرق ہے۔ دراصل ادب اور اس میں کسی تخلیق یا تصنیف کا کیا مقام ہے اس بحث کا تعلق تنقید سے ہے اور تبصرہ نگاری کتاب کے تجزیاتی تعارف اور قاری کے درمیان رابطے کا نام ہے بالخصوص قاری پر یہ واضح کرنا کہ کیا جدت، انکشاف اور معلومات ہیں۔ تبصرہ یوں سمجھیے کہ یہ الگ نئی کہانی ہے دوسرے لفظوں میں کتاب کے مواد کی مختصر تلخیص ہے یہ تعبیری اور وضاحتی ہوتی ہے تبصرہ نگار کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ قاری کو کتاب کے بارے میں اطمینان بخش معلومات پہنچائے تا کہ قاری خود اس نتیجہ کو اخذ کرنے کے قابل ہو جائے کہ آیا یہ کتاب اسے پڑھنی چاہیے یا نہیں جب کہ تنقید نگار کا حتمی کام یہ ہے کہ ادب کے حوالے سے اور اس کے آئینے میں فن پارے کو جانچے اور پرکھے اور نقاد کو یہ گمان بھی نہ رہنا چاہیے کہ قاری مصنف کی دیگر کتابوں کا (اگر موجود ہیں) مطالعہ کر چکا ہوگا۔

اب آیئے اس پہلو پر نظر کریں کہ تبصرہ کیوں ضروری ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ دراصل تبصرہ کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ زیر تبصرہ کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچے۔ عوام کے درمیان کتاب کو فروغ دینا، مشتہر کرنا اور مقررہ نشانہ کو حاصل کرنا تبصرہ نگار کا کام ہے۔ خصوصاً اردو حلقوں میں جہاں کتابوں کو خرید کر پڑھنے کا رجحان بہت کم پایا جاتا ہے۔ تبصرہ نگار کا ایک ثانوی کردار یہ بھی ہے کہ وہ معروف اشخاص کی مدد کرے یعنی ایسے لوگ جن کے پاس پڑھنے کے لیے وقت کی تنگی ہے مگر وہ معاصر ادب اور فکر کو جاننا چاہتے ہیں۔ یہ طبقہ اخبار اور رسائل میں شائع تبصروں کو کتاب کا متبادل سمجھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ معروف حضرات تبصرہ کو 'کتاب کا کیپسول' مانتے ہیں۔ جو کتاب کو یقیناً پڑھنا چاہتے ہیں مگر وقت کی کمی اجازت نہیں دیتی۔ ایسی صورت میں تبصرہ نگار ایسا تبصرہ کرے کہ ذوق مطالعہ رکھنے والے معروف حضرات کو تبصرہ مطالعۂ کتاب کا متبادل معلوم ہونے لگے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قاری جتنا مطالعہ کی امید

کر سکتا تھا اس سے کہیں زیادہ کتابیں شائع ہو جاتی ہیں تو ایسی صورت میں اخبار و رسائل کے ذریعے مہیا کرائے گئے اس کیپسول (تبصرہ) پر قاری انحصار کرتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تبصرہ کیسا ہونا چاہیے یعنی ایک اچھے تبصرہ کی خوبی کیا ہے؟ تبصرہ کے رہنما اصول کیا ہیں؟ دیکھیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ تبصرہ ایسا ہو کہ صاحب تصنیف کے نقطہ ہائے نظر اور دلائل و براہین پر قاری کو خود اطمینانی کی صورت پیدا ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ کتاب میں موجود تمام مواد، متن، اسلوب، مقصد و مدعا وغیرہ کو قاری کے ذہن میں پوری طرح باور کرانے کی کوشش کرے۔ تیسرے یہ کہ تبصرہ نگار کا تجربہ، تحریر کا انداز، اس کا ذوق اور جانچنے کا طریقہ بھی کتاب کے مطالعے میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ تبصرہ کی خوبی میں خود تبصرہ نگار کی اپنی شخصیت مطالعہ اور تجربہ کا بھی دخل ہے اور ایک اچھا تبصرہ نگار گویا قاری کے لیے سگنل کے کام پر متعین ہے اور تبصرہ نہ ہو تو کتاب گمنامی میں چلی جائے گی۔

ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا خراب (عامیانہ) اور متنازعہ کتابوں پر بھی تبصرہ ہونا چاہیے؟ ہوتا یہ ہے کہ معیاری اور اقداری اخبارات و رسائل ایسی کتابوں پر تبصرہ کے لیے جگہ نہیں دیتے نظر انداز کرنا مناسب سمجھتے ہیں، پھر بھی استثنائی اصول کے طور پر تبصرہ نگار اپنا فرض منصبی سمجھ کر قلم اٹھاتا ہے اور پر زور مذمت کرتا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے چاہے کسی بھی شعبے سے اس کا تعلق ہو ہمارے سامنے اس کی بہترین مثال مشہور محقق گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' پر یا سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کی کتابوں پر کیے گئے تبصرے ہیں۔

چلتے چلتے تبصرہ نگار کے تعلق سے چند اہم اور ضروری باتیں کہنا چاہوں گا۔ ایک کامیاب تبصرہ نگار وہ ہے جو زیر تبصرہ کتاب کے ہر لفظ کو پڑھے بلکہ ضرورت محسوس کرے تو ایک سے زائد مرتبہ بھی کتاب کو پڑھا جا سکتا ہے۔ چلیے اگر وقت کی تنگی دامن گیر ہو تو اس کا اعتراف لازمی ہے۔ تبصرے میں یہ بات آنی چاہیے بلکہ دلیل ہونی چاہیے کہ کتاب میں کیا جدت اور انکشاف ہے اور ساتھ ہی کیا فرسودہ اور اناپ شناپ۔ اگر یہ چیز واضح ہو جائے تو کتاب کی اہمیت و افادیت بھی معلوم ہو جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ قاری کے اندر مطالعے کا ذوق پیدا ہوگا۔ تبصرہ کرتے وقت چند

چیزوں کو ملحوظ خاطر رہنا چاہیے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ کتاب کا تعارف اور تعریف و توصیف

۲۔ مصنف کے بارے میں کچھ اہم معلومات

۳۔ مصنف کی اسی فن سے متعلق دیگر کتابوں (اگر موجود ہوں) سے تقابل

۴۔ مصنف کے اغراض و مقاصد کو کتاب کی توصیف و تشریح کے تناظر میں جانچنا۔

دیکھیے مصنف کبھی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ اس کی حمایت میں تبصرہ کیا جائے مگر وہ ضرور یہ چاہتا ہے کہ ایمانداری اور غیر جانبداری سے تبصرہ لکھا جائے اس کا مطلب ہے کہ کتاب کے واقعی مطالعہ کی بنیاد پر معروضی تبصرہ ہونا چاہیے۔ قاری کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ کتاب کس قسم کی ہے اور آیا متن کی کیا خوبی ہے۔ قاری کی نگاہیں تبصرہ نگار کی ماہرانہ جانچ پر ہوتی ہے کیوں کہ یہ فرض کیا جاتا ہے کہ تبصرہ نگار فن اور مصنف پر عبور رکھتا ہے۔ اب تبصرہ نگار کو یہ دیکھنا ہے کہ قاری کے ذہن کو کس طرح ڈھالا اور راغب کیا جائے مزید برآں کتاب کو اس کا جائز مقام دینا اور وقت پڑنے پر چیلنج کو قبول کرنا بھی ہے۔

ہمارے یہاں تبصرہ نگاروں کا معیار اتنا بلند نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہیے۔ دراصل اردو کی کتابوں کا تبصرہ کرنے کے لیے ہر کس و ناکس قلم اٹھالیتا ہے چاہے وہ اس فن سے واقف ہو کہ نہ ہو۔ مصنف اور اس کے نقطہ ہائے نظر پر نظر ہو یا نہ ہو، لکھنے کی مہارت اور مطالعہ کا ذوق بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ طالب علم جن کے علم میں ابھی گہرائی اور پختگی نہیں ہوتی وہ بھی تبصرہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم تبصرہ نگاری کو بہت ہلکا کام سمجھتے ہیں اور بڑے حضرات کے پاس دیگر مصروفیات کی بنا پر اتنا وقت نہیں ہے کہ تبصرہ کرنے بیٹھیں اور کتابیں ہیں کہ چھپ رہی ہیں۔ لوگوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پہنچنا بھی ہے۔

بہر حال آخر میں پبلشر، رسائل و اخبارات کے مدیران سے میری یہ گزارش ہے کہ تبصرہ نگاری کو بھی ایک اہم کام سمجھتے ہوئے کتاب کو ہر کسی کے حوالے نہ کریں بلکہ ماہرین سے ہی تبصرہ کرائیں اور ماہرین ادب و فن سے بھی یہ کہنا چاہوں گا کہ تبصرہ نگاری کی طرف بھی توجہ دیں۔

(ماہ نامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی، جون 2011ء)

نوآبادیاتی ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم سیاست اور قومیت میں

دیوبند، علی گڑھ اور جامعہ کا کردار

انیسویں صدی عیسوی ہندوستانی سیاست میں برطانوی سامراج کے بہ تدریج عروج کی صدی ہے جب کہ اٹھارھویں صدی عیسوی مغل شہنشاہیت کے رفتہ رفتہ زوال کی صدی اس صدی کا آغاز مغل بادشاہ اورنگ زیب کے انتقال سے ہوتا ہے کہ جس نے بکھرے ہوئے ہندوستان کو وحدت کی انتہا پر پہنچا دیا جو صرف تاریخ کا حصہ بن کر رہ گیا، اشوکِ اعظم اور اکبر اعظم کے دور میں بھی ہندوستان کی سرحدیں اتنی طویل نہیں تھیں یہ الگ بات ہے کہ کچھ مورخین اسی بات کو مغلوں کے زوال کا سبب مانتے ہیں بہر حال اس پرُ آشوب صدی کا خاتمہ انگریزوں کے آخری سب سے بڑے دشمن ٹیپو سلطان کی شہادت سے ہوتا ہے؛ چناں چہ انیسویں صدی انگریزوں کی صدی ہے ''جنگِ پلاسی'' سے لے کر ''ٹیپو سلطان'' کی شہادت تک ہر موقع پر کامیابی نے انگریزوں کے حوصلے اتنے بلند کردیے کہ مغل شہنشاہیت کے رعب و دبدبہ کو خاک میں ملا دیا اور دندناتے ہوئے اب ''دہلی'' میں داخل ہوگئے، لیکن یہ تاریخ کا بڑا روشن باب ہے کہ ۱۸۰۳ء میں فوراً شاہ عبدالعزیز نے دہلی میں بیٹھ کر ہندوستان کو ''دارالحرب'' قرار دے دیا، بہ ظاہر مغل شہنشاہ اور عظمتِ رفتہ کے نقوش پوری آب و تاب کے ساتھ باقی ہیں، مگر اپنے فتویٰ کے ذریعہ ہندوستان کے غلامی میں چلے جانے کا سگنل دے کر پوری ہندوستانی قوم کو متنبہ کر دیا بلکہ بیدار کر دیا، پوری انیسویں صدی مشرق و مغرب کے درمیان کشمکش کی صدی ہے، سیاست معاشرت، مذہب، تعلیم و تہذیب اور ثقافت

غرضیکہ ہر جگہ آویزش نظر آتی ہے، مجھے یہاں تعلیمی صورت حال کا جائزہ لینا ہے۔

انیسویں صدی میں انگریزی اقتدار کے استحکام کے ساتھ ہندوستان کے تعلیمی نظام میں رفتہ رفتہ تبدیلی شروع ہوگئی، آغاز سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے تعلیمی شعبہ کو عیسائی مشنریوں کے حوالے کر دیا جس کے دوررس نتائج مرتب ہوئے، اٹھارہویں صدی کے نصفِ آخر میں ہی سینٹ ڈیوڈ اور کلکتہ سمیت بنگال و مدراس پریسڈنسی میں متعدد اسکول قائم کر دیے اور جیسے جیسے انگریزوں کے قدم بڑھتے گئے اسکول بھی قائم ہوتے چلے گئے، عیسائی مشنریوں کے ذریعہ قائم کردہ اسکولوں نے ہندوستانی ثقافت کو متاثر کیا، چوں کہ بنگال ہی وہ صوبہ تھا جسے مکمل طور پر انگریز اپنے قبضہ میں لا چکے تھے اس لیے وہاں انگریزی تعلیم اور ثقافت کے اثرات سب سے پہلے دکھائی دیتے ہیں، بنگالیوں کی ذہن سازی کے لیے جدید ہندوستان کا اولین جدید انسان ''راجہ رام موہن رائے'' کی شکل میں نمودار ہوا جس نے انگریزی تعلیم کی پُرزور حمایت کی، جب کہ مسلمان بدلے ہوئے حالات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور مزید پستی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں کچھ چونکانے والے اعداد و شمار دیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''۱۸۶۹ء میں اسسٹنٹ انجینئروں میں ۱۴ ہندو اور مسلمان ایک بھی نہیں سپر وائزروں میں ۲۴ ہندو اور ایک مسلمان، اکاؤنٹینٹس ڈپارٹمنٹ میں ۵۰ ہندو اور مسلمان ایک بھی نہیں، سرکاری ملازمتوں کے علاوہ وکیلوں کی فہرست سبق آموز ہے، ایک زمانہ تھا کہ یہ پیشہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا مگر ۱۸۵۱ء سے تبدیلی شروع ہوگئی ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک لائسنس شدہ وکیلوں میں ۲۳۹، ہندو اور ایک مسلمان تھا'' (۱)

ہنٹر نے یہ اعداد و شمار بنگال کے دیئے ہیں مگر پورے ملک کی حالت اس سے بہتر نہ ہوگی، مسلمانوں کی اس صورت حال کے لیے کون ذمہ دار ہے انگریز، خود مسلمان یا پھر جدید تعلیمی نظام جسے مسلمان قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے، یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا ایک

بڑا طبقہ انگریزوں سے شدید نفرت کرتا تھا جس کی بنیادی وجہ شاید یہ ہے کہ صدیوں سے قائم مسلمانوں کے اقتدار کو انگریزوں نے چھین لیا تھا، مسلمان حالات کا مقابلہ کرنے اور بدلے ہوئے نظام کو قبول کرنے کے بجائے کم ہمتی اور مایوسی کا شکار ہو گئے انگریز دشمنی کے ساتھ ساتھ جدید تعلیمی نظام سے فائدہ اٹھانے پر بھی بہت دنوں تک آمادہ نہ ہوئے، ان کا صدیوں سے قائم جو تعلیمی نظام تھا وہ بھی رفتہ رفتہ دم توڑنے لگا، حالاں کہ ایک وقت وہ تھا کہ عہدِ وسطیٰ کے پورے ہندوستان میں مدارس کا مضبوط نیٹ ورک تھا، اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا چاہوں گا تاکہ اندازہ ہو جائے کہ مسلمانوں کے اندر ایسا نہیں کہ علم کا فقدان تھا اور انگریزوں نے آکر انھیں تعلیم یافتہ بنایا۔

صدیوں سے ہندوستان میں دہلی، لکھنؤ، جونپور، رام پور، لاہور، احمد آباد، حیدر آباد، بیدر اور بیجاپور وغیرہ مسلم تعلیمی اور ثقافتی مراکز کے طور پر پہچان رکھتے تھے۔ ''علامہ مقریزی'' نے ''کتاب الخطط'' میں لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق کے دور میں صرف دہلی کے اندر ایک ہزار مدرسے تھے، اور خاص بات یہ ہے کہ لڑکیوں کے پڑھنے کا بھی انتظام تھا، چناں چہ شرفاء کی خواتین کے ساتھ ساتھ ان کی خادمائیں تک عالمہ ہوتی تھیں، خود محمد تغلق بھی عالم فاضل تھا (۲)۔ فیروز شاہ تغلق کا عہد تو تعلیم کے لحاظ سے عہدِ زریں ہے اس وقت ایک لاکھ اسّی ہزار غلاموں تک نے تعلیم حاصل کی دہلی میں اس نے شاندار مدارس بنوائے اور قدیم مدارس کی تجدید کی (۳)۔ سکندر لودھی نے بھی کئی مدارس بنوائے کائستوں اور برہمنوں نے اس کے عہد میں فارسی کی تعلیم شروع کر دی تھی، جونپور کے شرقی سلاطین تو ایسے علم دوست تھے کہ اس شہر کو ''شیرازِ ہند'' کا خطاب دیا گیا، ہندوستان کی تعمیر وترقی میں کئی نمایاں کام انجام دینے والے شیر شاہ سوری جونپور کے ایک مدرسہ کا فارغ تھا (۴)۔ اکبر بادشاہ کی رضاعی ماں ماہم بیگم نے ۱۵۶۱ء میں ''خیر المنازل'' نام سے ایک مدرسہ بنایا جس کے کھنڈر آج بھی دہلی میں پرانے قلعہ کے پاس موجود ہیں شاہ جہاں نے مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی میں تعلیم کا نظم کیا ''دار البقا'' نام سے ایک اور مدرسہ بھی بنوایا تھا، مسجد اکبر آبادی اور مدرسہ دار البقا کو انگریزوں نے مسمار کر دیا، مسجد فتح پوری میں آج بھی تعلیمی سلسلہ جاری ہے (۵)۔ اورنگ زیب تو بدنام بادشاہ ہے ہی یہ کٹر مسلمان مسلمانوں کی تعلیم سے بے خبر رہے ایسا کہاں ہو سکتا ہے،

چناں چہ اس کے عہد کی خاص بات ہے کہ شہروں کے علاوہ دیہات وقصبات میں بھی مدارس قائم ہو گئے طلباء کو وظائف بھی دیے جاتے تھے،لکھنؤ کا مدرسہ فرنگی محل اسی کی یادگار ہے، مدرسوں یں اب تک جو نصاب درس نظامی کے نام سے رائج ہے اس کے تیار کرنے والے ملاّ نظام الدین کو اورنگ زیب نے فرنگی محل نام سے ایک حویلی عطا کی تھی جس کی وجہ سے اس کا نام فرنگی محل ہو گیا، یہاں بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے ،آخری بڑے عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی ہیں جنھوں نے موہن داس کرم چند گاندھی کو ''مہاتما'' اور علی گڑھ کے گریجویٹ محمد علی جوہر کو ''مولانا'' کا خطاب دیا(٦)۔مغلوں کے زوال کے وقت بھی دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ نے علم کی شمع کو روشن رکھا ان کے والد شاہ عبدالرحیم کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ کو انھوں نے ترقی دی محمد شاہ رنگیلا نے جب ''مہندیان'' میں جگہ تنگ ہو گئی تو ''کوچہ چیلان'' میں ایک بڑی حویلی مدرسہ کو عنایت کی یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی نذر ہو گیا(٧)۔اسی طرح دکن کی بہمنی سلطنت میں وسط ایشیا اور ایران وغیرہ سے اہل علم حضرات بڑی تعداد میں آتے رہے اور مدارس کی سرپرستی کرتے رہے دکن میں علم دوست کی حیثیت سے سب سے زیادہ شہرت ''محمود گواں'' کو حاصل ہے، جس نے بیدر میں ایک عالی شان مدرسہ کی تعمیر کی اس کی عمارت آج بھی موجود ہے، بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ اپنی مملکت میں تعلیم حاصل کرنے والے تمام طلباء کو ماہانہ ایک ہون (سونے کا سکہ) وظیفہ دیتا تھا، ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں دکن کے ایک مقام ''ہنور'' کا ذکر کرتا ہے جہاں اس نے لڑکیوں کے تیرہ مکاتیب کا مشاہدہ کیا۔

یہ ایک بہت مختصر سا خاکہ تعلیم گاہوں کا میں نے آپ کے سامنے رکھا تا کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ انیسویں صدی میں مسلمانوں کی تمام شعبوں کے ساتھ تعلیمی میدان میں جو پستی ہے اس کا ماضی تابناک تھا اور مسلمان قوم طبعی طور پر ان پڑھ یا دیگر اقوام سے کم پڑھی لکھی تھی ،ایسا نہیں تھا، بلکہ حالات نے اسے مجبور کر دیا تھا، مسلمانوں کی خوشنودی یا پھر کمپنی ے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے گورنر جنرل ''وارن ہسٹنگز'' نے ۱۷۸۱ء میں ''کلکتہ مدرسہ'' قائم کیا جو حکومت کی جانب سے قائم کیا گیا ہندوستان کا شاید آخری مدرسہ ہے جہاں صرف مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، مگر بدلتے

ہوئے حالات کے پیش نظر اس نے اپنی افادیت کھودی، خود کمپنی کے عہدہ داروں اور راجہ رام موہن رائے وغیرہ نے اس مدرسہ کی مخالفت کی رہا فورٹ ولیم کالج تو یہ صرف نووارد انگریز افسران کو ہندوستانی زبان سکھانے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا جو بیس سال تک چلتا رہا، البتہ دہلی کالج ہندوستانیوں کے لیے قائم کیا گیا دہلی میں غازی الدین حیدر نام کا مدرسہ تھا اسی عمارت کو لے کر ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج بنایا گیا لکھنؤ کے نواب اعتمادالدولہ نے مشرقی علوم کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی رقم دی، علم دوست یوروپین پرنسپل اس کالج کو ملے جس میں ڈاکٹر اشپر نگر کا نام خصوصیت کا حامل ہے، چناں چہ یہ کالج ترقی کرتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہوا تو یہ کالج اس کا شکار ہو گیا اور ۱۸۷۷ء میں لاہور اورینٹل کالج میں اسے ضم کر دیا گیا، اسی کالج کے مشرقی شعبہ کے صدر ''مولوی مملوک علی نانوتویؒ'' تھے جو ولی اللہی تحریک کی نمائندگی کر رہے تھے، مولوی قاسم نانوتوی، مولوی رشید احمد گنگوہیؒ اور مولوی ذوالفقار علی دیوبندی وغیرہ اسی کالج کے تعلیم یافتہ اور مولوی مملوک علی نانوتویؒ کے شاگرد تھے جنھوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔

میرے خیال میں اگر ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش نہ آتا تو شاید دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وجود میں نہ آتے، ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے درمیانی سو سالوں میں انگریزوں کے خلاف گرچہ رہ رہ کر مختلف جگہوں پر بغاوت ہوتی رہی، بغاوت یا مزاحمت کے واقعات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ ہندوستانی عوام انگریزوں کی بالادستی کو ناپسند کرتے تھے اگر بات صرف حکومت کرنے کی ہوتی تو شاید انگریزوں کو تسلیم کر لیا جاتا کیوں کہ ہندوستان کی تاریخ میں انگریز پہلے بیرونی حملہ آور نہیں تھے بلکہ ان سے پہلے مغل، دہلی سلطنت کے تمام خاندان کوشان پارتھیائی، شک اور آریہ وغیرہ باہر سے آئے، یہاں پر حکومت کی اور ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا، مگر انگریز حکمراں ہندوستان کو اپنا وطن بنانے کا خیال بھی نہیں لا سکتے تھے، ان کے نسلی تفوق نے ''کالونیل فکر'' کو جنم دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک اقتصادی بحران اور قحط سالی سے دوچار ہو گیا کیوں کہ دولت کا بہاؤ ''لندن'' کی طرف تھا ظاہر سی بات ہے کہ کروڑوں کی آبادی والا ملک بے اطمینانی کا شکار ہو گا اور سونے کے سکوں سے کھیلنے والے دو وقت کی روٹی کے محتاج بن جائیں گے۔ اس بے

اطمینانی اور بغاوت کے جذبہ کو فرو کرنے کے لیے انگریز دور کی کوڑی لائے، یعنی ہندوستان کو اپنا ہم مذہب بنالو اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تربیت یافتہ عیسائی مشنریوں کے کارندوں کو ملک کے طول وعرض میں پھیلایا گیا جنھوں نے مناظروں کا بازار گرم کردیا انگریز ہندوستان میں جدید تعلیم کو بھی زیادہ فروغ دینا نہیں چاہتے تھے، چناں چہ ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ میں تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے صرف ایک لاکھ روپۓ مختص کئے گئے مگر وہ بھی دس سال تک خرچ نہ ہوسکا، ہندوستانیوں کو اتنا ہی تعلیم دینا چاہتے تھے کہ دفتروں کے لیے کلرک مہیا ہو جائیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس نے انگریزوں کے خلاف بغاوت نفرت اور شدید ردِ عمل کے مواقع پیدا کئے ملک گیر پیمانے پر ردِ عمل کی آخری کوشش ۱۸۵۷ء میں کی گئی جس میں ہر طبقہ نے حصہ لیا، مگر جلد ہی انقلاب کو کچل دیا گیا قلیل مدت میں انگریزوں نے پورے انقلاب کو کیسے قابو میں کرلیا یہ الگ موضوع ہے ظلم وستم کی کون کون سی تاریخ دہرائی گئی اس کو بیان کرنے کا یہاں موقعہ نہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد ملک کا پورا منظر نامہ بدل گیا، اب ہندوستان جدید دور میں داخل ہوگیا، ہندوستانیوں نے مزاحمت کا راستہ ترک کردیا اور اپنے اپنے طور پر سیاسی، معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی، اور مذہبی اصلاحی کوششوں پر اپنی توجہ مرکوز کی، دارالعلوم دیوبند کے بانیان مولانا قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان کے پیر ومرشد حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں عملی طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، شاملی کے محاذ پر باقاعدہ ان حضرات نے جنگ لڑی، انگریزوں کی سزاؤں سے یہ حضرات کسی طرح محفوظ رہے، انقلاب کے بعد انگریزوں کے عتاب سے بچے رہنے والے علماء کچھ عرصہ تک مسلمانوں کی پستی روز بروز بگڑتی ہوئی صورت حال اور انگریز حکمرانوں کے ذریعہ برتے جانے والے امتیازی سلوک کا جائزہ لیتے رہے ساتھ ہی اس کے سدِ باب کے پہلوؤں پر بھی غور کرتے رہے، ایک بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اسلام کے خلاف خود مسلمانوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کی لہر چل پڑی تھی، عوامی مقامات پر بڑے بڑے مجمع کے روبرو "تثلیث" نے "توحید" پر حملے شروع کردیۓ، پہلی مرتبہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں اسلام کے خلاف لٹریچر بڑی تعداد میں شائع ہونے لگے، دراصل اسلام سے ہی مسلمانوں کا

وجود ہے اگر اسلامی عقائد میں دراڑ پڑگئی تو مسلمانوں کا معاشرہ اور ان کا ملّی تشخص بھی کمزور پڑ جائے گا، اسلامی تعلیمات کے لیے مدارس کا نظام جو عہدِ وسطیٰ میں قائم تھا وہ بھی ختم ہوگیا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان میں اسلام کی صحیح شکل کو کیسے باقی رکھا جائے؟ اس کی سرپرستی کے ذرائع معدوم ہوگئے بلکہ اب معاندانہ ماحول پیدا ہوگیا، بہت غور وخوض کرنے کے بعد یہ علماء اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک ادارہ کا قیام ناگزیر ہے جس کے دو بنیادی مقاصد ہوں ایک یہ کہ خالص اسلامی علوم پر مہارت رکھنے والے افراد پیدا ہوں دوسرے ان کی ایسی ذہنی تربیت کی جائے کہ ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس کریں بہ الفاظِ دیگر وطن پرستی کا جذبہ بیدار کیا جائے اور خاموش طریقہ سے ہر ممکنہ وہ کوشش کی جائے جس سے انگریز ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوجائیں۔ سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

"(اس وقت) مسلمانوں کے سامنے دو اہم مسئلے تھے ایک مسئلہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کا تھا اور دوسرے کی نوعیت سیاسی تھی جس کا مقصد ہندوستان کو سامراجی اقتدار سے نجات دلانا تھا" (۸)

ایک جگہ اور واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند صرف ایک دینی تعلیم گاہ ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت ایک مؤثر اور فعال تحریک ہے... مسلمانوں کے دلوں سے خوف اور ڈر کو دور کرکے سیاسی اعتبار سے انھیں اس لائق بننے میں مدد بہم پہنچائی تاکہ وہ آزادی کی تحریک میں قائدانہ طور پر حصہ لے کر مسلمانوں کے قومی وقار کو بلند کرسکیں" (۹)۔

"آچاریہ ونوبا بھاوے" ۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو دارالعلوم دیوبند آئے اس وقت انھوں نے ایک جامع تقریر کی تھی جس کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"یہی ایک ادارہ ہے جس نے پہلے دن سے برٹش سامراج کی مخالفت کی اور اس مخالفت میں ہر محاذ پر سب سے پہلے قربانیاں پیش کیں" (۱۰)۔

چناں چہ ادارہ کے لیے دو بنیادی مقاصد ٹھہرے ایک کی نوعیت علمی ہے جب کہ دوسرے کی

نوعیت معاشرتی اور سیاسی اس میں کامیابی کے لیے عوامی رابطہ ضروری تھا۔ اسی غرض سے عوامی تعاون سے ادارہ کو چلانے کا فیصلہ لیا گیا اور ''صاحب بہادر' حضرات کی نظروں سے محفوظ رہے اس لیے چھوٹی جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ بالآخر دہلی سے ۱۴۵ رکلومیٹر کی دوری پر واقع ایک چھوٹے سے قصبہ ''دیو بند'' میں دار العلوم کے قیام کو قطعیت دے دی گئی سید محبوب رضوی رقم طراز ہیں:

> ''۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء بروز جمعرات چھتے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب یا نمائش کے بغیر دار العلوم کا افتتاح عمل میں آیا'' (۱۱)

مدرسہ قائم ہوتے ہی اس کی شہرت اور مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ حتی کہ بیرون ملک سے بھی طلباء پڑھنے کے لیے آنا شروع ہوئے۔ اسلامی دنیا میں اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا شروع سے ہی اس ادارے کو ایسے لوگ ملے جو خلوص وللّٰہیت ،تقویٰ ،سادگی اور علوم وفنون میں ممتاز مقام رکھتے تھے، ہندوستان کی متعدد ریاستوں کی جانب سے بڑی بڑی تنخواہوں پر ان بوریہ نشینوں کو بلایا گیا مگر ان حضرات نے دار العلوم میں سادگی کے ساتھ رہ کر علوم کی اشاعت اور قوم کی خدمت کو ترجیح دی، جہاں تک اس کے پہلے بنیادی مقصد کا تعلق ہے یعنی اسلامی علوم کا تحفظ ،اشاعت اور عقائد کی درستگی تو اس میدان میں دار العلوم پورے طور پر کامیاب رہا، اب تک اس نے بڑی تعداد میں فقیہ، محدث، مفسر، مشائخ، مبلغ، مصنف، ادیب، صحافی، شاعر اور مختلف علوم وفنون کے کہنہ مشق اساتذہ تیار کیے جن سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورا عالم اسلام مستفیض ہو رہا ہے، اس مقالہ میں طوالت کی بناء پر مثالیں دینے کی گنجائش نہیں ہے، جہاں تک عقائد کی درستگی کی بات ہے روز اوّل سے ہی اس نے ان تمام قوتوں کا مقابلہ کیا جو اسلامی فکر، اصول شرع اور کتاب وسنت سے دور کرنے کی کوشش کی یہی دراصل وہ فکر ہے اور اس معاملہ میں ''صلح کل'' نہ کرنے کا مزاج ہے۔ جس نے صرف لفظ ''دیو بند'' کو معنی پہنا دیئے اور یہ لفظ زبان پر آتے ہی قصبہ دیو بند نہیں بلکہ ایک ''مکتبۂ فکر'' کا تصور ذہن میں آجاتا ہے، بہر حال برطانوی ہند سے لے کر آزاد

ہندوستان کی اکیسویں صدی کے داخلے تک دارالعلوم کے اس فکری استقلال نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر وہ اعتماد پیدا کیا اور خود اس ادارے کا جو وقار بلند ہوا وہ ہم سب جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی کہی ہوئی کسی بات، فیصلہ یا فتویٰ کا ہندوستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری عوام پر کتنا اثر ہوتا ہے، اور خود حکومت ہند کے نزدیک بھی اس کی قدر و قیمت ہے اس طرح دارالعلوم دیوبند نے صدیوں سے قائم اقتدار سے محرومی کے بعد مسلمانوں کے ملّی تشخص، احیائے دین اور اسلامی علوم کی نشاۃ ثانیہ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر میں اس فکر کے ہزاروں مدارس کے قائم ہونے میں بھی اسی نے حوصلہ عطا کیا۔

ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ دارالعلوم نے علم کو معاش یا روزگار سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی کہ یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اچھی ملازمتیں حاصل ہو جائیں اور قوم کی معاشی حالت مستحکم ہو جائے جیسا کہ علی گڑھ کا مقصد تھا آگے چل کر ہم اس پر بات کریں گے، بہر حال بہت سارے لوگوں کی نظروں میں یہ چیز کھٹکتی ہے کہ پھر فائدہ کیا؟ دراصل اربابِ دیوبند کی نظر میں اسلام پہلے مسلمان بعد میں اور اربابِ علی گڑھ کی نظر میں مسلمان پہلے اور اسلام بعد میں لہٰذا ایک نے اسلام کی خدمت کی دوسرے نے مسلمانوں کی اور دونوں کی اہمیت وافادیت اپنی اپنی جگہ ہے، دارالعلوم کی یہ خدمت اتنی تابناک ہے کہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد ۱۳ر جولائی ۱۹۵۷ء کو دارالعلوم دیوبند میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> ''دارالعلوم کے بزرگ علم کو علم کے لیے پڑھاتے رہے ہیں.. یہ صرف دارالعلوم یا مسلمانوں کی خدمت نہیں بلکہ پورے ملک اور دنیا کی خدمت ہے... دارالعلوم میں آکر میں بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے کچھ لے کر جا رہا ہوں'' (۱۲)

علم برائے علم کے مقصد کو صاحبِ بصیرت لوگوں نے مستحسن نظروں سے دیکھا ہے کئی یوروپین اسکالروں نے بھی دارالعلوم کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس پر اپنی مثبت رائے کا اظہار کیا ہے، ایک بات اور ذہن میں رہے کہ اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ اربابِ دیوبند نے عصری

علوم کی مخالفت کی، سرسید کی تعلیمی تحریک کو کبھی برا نہیں سمجھا بلکہ سرسید مرحوم اور مولانا قاسم نانوتوی میں اچھے مراسم تھے، بعض مذہبی معاملات میں اختلافات تھے، سرسید کی زندگی کا وہ ایسا گوشہ تھا کہ خود ان کے رفقاء بھی اس معاملہ میں اتفاق نہیں رکھتے، بہر حال یہ قوم کے دونوں ہمدرد ایک دوسرے کے کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مولانا قاسم نانوتویؒ ایک جگہ سرسید کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہل اسلام کا معتقد ہوں
اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے'' (۱۳)

مدرسہ کی ۱۲۶۹ھ کی سالانہ رپورٹ سرسید نے دیکھی جس میں دارالعلوم کا مالی بحران درج تھا، اس پر سرسید نے تہذیب الاخلاق کے صفحات پر ایک درد بھری تحریر لکھی اس کا کچھ حصہ دیکھئے:

''جو مدرسہ ہم قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں علوم انگریزی اور دیگر علوم
دنیاوی بشمول علوم دینی پڑھائیں گے اس کو کرستانی مدرسہ ٹھہراتے
ہیں.... عربی مدرسہ دیوبند جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں ہے....
جس میں مولوی محمد قاسم سا فرشتہ سیرت نگراں ہے اور مولوی محمد یعقوب
صاحب سا شخص مدرس ہے کچھ مدد نہ کریں'' (۱۴)

اس سے اندازہ لگایئے کہ دیوبند اور علی گڑھ میں کوئی کشمکش نہیں ہے بس کام کے طریقہ کار میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر ہیں مخلص۔ سرسید مرحوم مدرسہ دیوبند کی ترقی کے خواہاں ہیں اور مولانا نانوتوی سرسید مرحوم کو اہل اسلام کا دردمند شخص سمجھتے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا نانوتوی انگریزوں کے دشمن تو ہیں مگر انگریزی و مغربی علوم کے نہیں، ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ جنھیں مغربی علوم حاصل کرنا ہے انھیں انگریزی اسکول میں جانا چاہیے (۱۵)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے انگریزی پڑھنے سے منع نہیں کیا اس وقت بعض مصلحتوں کی بناء پر دارالعلوم میں انگریزی پڑھنے کا انتظام نہیں کیا گیا۔ اِدھر تقریباً بیس برس قبل دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ کمپیوٹر اور شعبۂ انگریزی کا قیام عمل میں آچکا ہے، شعبۂ انگریزی کے اس دو سالہ کورس میں دارالعلوم کے طلباء انگریزی زبان میں بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیو بند کا دوسرا بنیادی مقصد جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانا اور وطن پرستی کا جذبہ بیدار کرنا ہے، اس مقصد کے لیے جو کوشش اس ادارہ نے کی پوری دنیا اس کی معترف ہے، جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں اسے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا دور وہ ہے جب ادارہ کے بانیوں نے سرفروشی کے جذبہ سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حصہ لیا، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، بس ''ہندوستان ٹائمز'' کے ۱۶ر جولائی ۱۹۵۷ء کے اداریہ کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہوں گا اخبار لکھتا ہے:

''جن لوگوں نے ۱۸۶۶ء میں دیوبند کی درس گاہ کی بنیاد رکھی ان میں
وہ علماء تھے جنھوں نے دس سال پہلے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا...
دیوبند کے رہنماؤں نے خود کو ان تمام تحریکوں کے ساتھ سرگرمی کے
ساتھ وابستہ رکھا جن کا مقصد ملک کے لیے آزادی حاصل کرنا تھا''۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی ''تحریک ریشمی رومال'' کو جدوجہد آزادی کا دوسرا دور کہا جاسکتا ہے، دارالعلوم دیوبند کے اس اوّلین طالب علم نے درس وتدریس کی آڑ میں آزادی کی انتہائی منظم اور خفیہ تحریک چلائی کہ برطانوی حکومت خود دھوکہ کھا گئی اور اس تحریک کا بانی ''مولانا عبیداللہ سندھی'' کو سمجھ بیٹھی جب کہ مولانا سندھی کو شیخ الہند نے جب افغانستان، ترکی، جرمنی اور روس کے سفر پر روانہ کیا تو انھیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ بیرون ملک بھی اس کا اتنا بڑا نیٹ ورک ہے، تحریک آخری مرحلہ میں پہنچ چکی تھی، حکومت کی تشکیل بھی دی جاچکی تھی جس کا صدر راجہ مہندر پرتاب کو بنایا گیا، راز افشا ہونے پر شیخ الہند کو تقریباً تین سال تک جزیرۂ مالٹا میں قید کر کے صعوبتوں میں رکھا گیا، ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو جب رہا ہو کر ممبئی کے ساحل پر اترے تو استقبال کرنے والوں میں موہن داس کرم چند گاندھی بھی موجود تھے، انتہائی سخت علالت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے اور ترک موالات کو درست ٹھہراتے ہوئے ایک آزاد اور نیشنل یونیورسٹی کی تجویز پیش کی جس کا حکومت سے کوئی تعاون نہ ہو اس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پڑھا گیا آپ کا خطبہ جامعہ کا تاسیسی خطبہ سمجھا جاتا ہے۔ شیخ الہند نے

وطنیت اور قومیت کے تصور اور ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو جدو جہد آزادی کے لیے اہم قرار دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فرقہ واریت کے عفریت کو یہ حضرات بہت پہلے بھانپ گئے تھے۔

۱۹ر جولائی ۱۹۵۷ء کے الجمعیۃ اخبار دہلی نے اداریہ میں لکھا تھا:

> ''تحریک آزادی کے ابتدائی دور میں جب کہ نیشنلزم دودھ پیتے بچے سے زیادہ نہ تھا جب علماء دیوبند نے اپنی حکومت کا نقشہ بنایا تو اس کی صدارت کے لیے ان کی نظرِ انتخاب ''راجہ مہندر پرتاپ'' پر پڑی ہمیں کہنے دیجئے کہ اس سے بہتر اور صاف ستھرا نیشنلزم آج تک پیدا نہ ہوسکا''۔

اس ادارہ کے جدو جہد آزادی کے تیسرے دور کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی ہیں جو اپنے استاذ شیخ الہند کے فکر، جذبہ اور تحریک کے تاحیات ترجمان رہے، اپنے استاذ کی خدمت کی غرض سے یہ بھی مالٹا میں نظر بند رہے، ہندو مسلم اتحاد کو آزادی کے لیے انھوں نے ضروری سمجھا، یہی وجہ ہے کہ تقسیمِ وطن کی انھوں نے زبردست مخالفت کی ۱۹۱۹ء میں قائم کردہ جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے انھوں نے ملک گیر آزادی کی تحریک چلائی کانگریس سے اتحاد پر زور دیا، ملک آزاد ہوا مگر تقسیم بھی ہوا، ہندوستانی مسلمانوں پر جن لوگوں کا احسان ہے ان میں مولانا حسین احمد مدنی بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ ظفر علی خاں مرحوم ایڈیٹر زمیندار نے کیا خوب کہا تھا:

شاد باش و شاد زی، اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تونے کیا، اسلام کا جھنڈا بلند
اِسم تیرا بامسمیٰ، ضرب تیری بے پناہ
دیو استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند
تو علم بردارِ حق ہے، حق نگہباں ہے ترا
خیلِ باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند

جیسا کہ عرض کی جاچکا ہے انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں انگریز اور ہندوستانی مسلم ثقافت کے اثرات دکھائی دینے لگتے ہیں جس کا ملا جلا عمل اور ردِ عمل کا سلسلہ چل پڑتا ہے، جب

ہم ثقافت یا تہذیب کی بات کریں گے تو انسانی زندگی کے تمام اہم شعبوں مثلاً سیاست، مذہب، معاشرت، ادب اور تعلیم پر گہری نظر ڈالنی پڑے گی۔ کہ یہی شعبے مل کر ثقافت کی تشکیل دیتے ہیں اس میں اداروں کا بڑا کردار ہوتا ہے بلکہ ادارے اسی لیے قائم ہی کئے جاتے ہیں ابھی ہم نے دیوبند کی بات جو خالص مذہبی علوم کا ادارہ ہے۔ جس کے بنیادی مقاصد کا ذکر آچکا۔ اب ہم علی گڑھ کی بات کریں گے جس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کا اصل محور سر سید مرحوم کی شخصیت ہے۔ جس نے ہندوستانی قوم اور اس کی زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی تحریروں تقریر، سوسائٹیوں، انجمنوں اور اداروں کے ذریعہ متاثر کیا، اس شخص کے خواب کی تعبیر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب سے قبل سر سید کا علمی سفر گرچہ جاری تھا آثار الصنادید وغیرہ منظر عام پر آچکی تھیں، انگریزی سرکار کے ملازم تھے، ساتھ ہی عظمتِ رفتہ کے مداح بھی مگر انقلاب کے بعد وہ سید احمد خاں نہیں تھے بلکہ قوم کا دردمند مصلح "سر سید" تھا جو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے جیتا تھا اور آخر دم تک اس پرکار بند رہا، اس وقت جو حالات تھے دیکھ دیکھ کر سر سید پر کیا گزرتی تھی انھیں کے الفاظ میں:

> "....اور جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا.....آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے.....تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے، استقلال، استقلال، استقلال، ہمت، ہمت، ہمت، کوشش، کوشش، کوشش، ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ نہ پرواہ کرنی چاہیے"۔ (۱۶)

انقلاب میں سر سید نے بجائے ہندوستانیوں کے کھل کر انگریزوں کی حمایت کی اس میں کوئی لالچ یا غرض شامل نہیں تھی بلکہ ان کی نگاہیں دور رس تھیں انھیں اس بات کا کامل یقین تھا کہ جلد ہی انگریز اس انقلاب پر قابو پالیں گے اس کے بعد قوم کا برا حال ہوگا، بہر حال حالات معمول پر آنے

کے بعد انگریزوں نے جاگیروں سے نوازنا چاہا مگر انکار کردیا، انقلاب کے وقت وہ بجنور میں تھے،
''اسباب بغاوت ہند'' نام سے رسالہ لکھا جس میں ہم وطنوں کو بغاوت اور شورش کے الزام سے
بری کردیا ہے، اس کی وجہ حکومت کی غلط پالیسیوں کو بتایا ہے، یہ ان کا ایک جرأت مندانہ قدم تھا
تحقیقات کے لیے حکومت نے کمیشن بنایا تو سرسید ہی واحد ہندوستانی ممبر تھے، اس موقعہ پر سرسید
نے بے خطا لوگوں کی حمایت کی پھانسی سے بچالیا، سرسید کا یہ سیاسی موقف اپنی مثال آپ ہے
انگریزوں کی حمایت ملک وقوم کی دشمنی میں نہیں بلکہ ہمدردی کے جذبے سے کی لوگ اس وقت سمجھ
نہیں سکے، بعد میں جب معاشرت، ادب اور تعلیم میں اصلاحی اقدامات اٹھائے تو لوگ ان کی
حمایت اور مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے، سرسید کی زیادہ مخالفت ان کے مذہبی افکار کی وجہ سے
ہوئی، مذہبی معاملات میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ بے وجہ نہیں ہے دراصل عیسائی مبلغین اور انگریز
مصنفین اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کررہے تھے، اس کے جواب میں انھوں نے قلم
اٹھایا، ''خطباتِ احمدیہ'' اس کی بہترین مثال ہے، مگر اسلام کو عقل سے تطبیق کرنے کے جوش میں
کچھ ایسی چیزوں کا انکار کربیٹھے جو اسلامی عقائد کا حصہ ہیں، اسی بنیاد پر کچھ لوگ کفر کا فتویٰ بھی لے
کرآئے، ان کے رفقائے کار جو سرسید کے مشن میں پورا ساتھ دیتے مگر سرسید کے مذہبی افکار سے
اتفاق نہیں کرتے تھے۔

سرسید کی معاشرتی اصلاحی کوششیں قابل تعریف ہیں اسی مقصد سے انھوں نے تہذیب
الاخلاق پرچہ کا اجراء کیا جس کا خاکہ لندن میں بیٹھ کر بنالیا تھا یہ انگریزی ثقافت کے اثرات کا نتیجہ
ہے، برطانیہ میں اسٹیل اور ایڈیسن نے ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کے ذریعہ معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کی
اور اپنی قوم کو بھلائی کی جانب رغبت دلائی، لندن کے قیام کے دوران سرسید کو یہاں سے جلا ملی اور
ہندوستان واپس آکر آخری وقت تک تہذیب الاخلاق پرچہ میں کاہلی، خوشامد، تعصب، بحث وتکرار
، قومی نفاق، ظاہر داری، ناشائستہ گفتگو اور تصنع وغیرہ پر لکھتے رہے۔

علی گڑھ تحریک نے ادب کو بھی متاثر کیا، جدید تعلیم کے لیے کوششوں کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ
انگریزی ادب کی اصناف، ہیئت، اسلوب اور موضوع کو ہندوستانی ادب میں روشناس کرایا، اردو

ادب میں شعری اصناف کی روایت بڑی توانا رہی ہے، غزل ہی اس کی نمائندہ صنف رہی مگر علی گڑھ نے نظم نگاری اور نیچرل شاعری کے فروغ کی بات کی، وہ شاعری جو انسانی فطرت، حقیقت اور زمین سے قریب ہو، سرسید کے رفقاء میں حالی کا نام سرفہرست ہے، جنھوں نے اسے فروغ دیا بعد میں انجمن پنجاب لاہور اور محمد حسین آزاد نے تحریک کی شکل دیدی، غزل کے موضوعات میں تبدیلی لائی گئی، نثری اصناف میں ناول نگاری، سوانح وسیرت نگاری، مضمون نگاری، تاریخ نویسی، خاکہ نگاری وغیرہ کا آغاز علی گڑھ نے ہی کیا، حالی نے مقدمہ شعروشاعری کے ذریعہ اردو میں تنقید کی راہیں ہموار کردیں، اسلوب کو فطری، سادہ، عام فہم اور آسان بنانے پر زور دیا گیا، غرضیکہ اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات ہی نہیں احسان ہیں، نورالحسن نقوی کہتے ہیں:

> ''وہ (سرسید) ادب کو محض وقت گزاری کا ذریعہ اور دل بہلانے کا وسیلہ نہیں مانتے تھے، اس بات پر ان کا ایمان تھا کہ ادب سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں، اس سے زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے میں مدد لی جاسکتی ہے، قوموں کے اخلاق درست کیے جاسکتے ہیں، اور سوتوں کو بیدار کیا جاسکتا ہے ہمارے ادب کی تاریخ میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادب کے ان امکانات کی طرف اشارہ کیا، خود ادب سے کام لے کر مردہ قوم میں جان ڈال دی''۔ (۱۷)

سرسید کی سب سے زیادہ خدمات تعلیمی شعبہ میں ہے۔ مسلمانوں کے معاشی ابتری کی بہتری اور پسماندگی کو دور کرنے کے لیے جدید تعلیم کو انھوں نے ضروری سمجھا، اس سلسلہ میں انھوں نے کوششیں تیز کردیں اور خاص بات یہ ہے کہ ملازمت کی غرض سے جہاں جہاں قیام رہا وہاں انھوں نے تعلیم کے لیے کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھایا، اس سلسلہ کی آخری کڑی آخری آرام گاہ علی گڑھ میں ''ایم اے او'' کالج کا قیام ہے، انقلاب کے بعد بجنور سے مراد آباد تبادلہ ہوا تو ۱۸۵۹ء میں انھوں نے پہلا اسکول قائم کیا پھر غازی پور آئے تو ۱۸۶۳ء میں دوسرے اسکول کی بنیاد رکھی، گرچہ ان اسکولوں میں انگریزی پڑھنے کا انتظام تھا مگر سرسید کا خواب تھا کہ جلد سے جلد تمام جدید علوم کی تعلیم کا نظم قائم ہوجائے یہ ایک بڑا چیلنج تھا کیوں کہ علوم انگریزی میں تھے اور ہندوستان میں ابھی انگریزی

کی تعلیم عام نہیں تھی بلکہ مخالفت ہی زیادہ تھی۔اس مسئلہ کا حل سر سید نے تلاش کیا کہ تمام جدید علوم اور سائنس کی کتابوں کا یوروپی زبانوں سے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا جائے حالاں کہ یہ ایک بڑا کام تھا بہر حال سر سید تو عزم، ارادہ اور استقلال کے پہاڑ تھے، اسی مقصد کی تکمیل کے لیے غازی پور میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا قیام عمل میں آیا، پروفیسر افتخار عالم خاں کے مطابق ۹رجنوری ۱۸۶۴ء کو غازی پور میں سر سید کے مکان پر سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اس میٹنگ میں کافی تعداد میں انگریزوں اور ہندوستانیوں نے شرکت کی (۱۸)۔علمی وادبی کتابوں کے تراجم کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کے کچھ اور بھی مقاصد تھے ایک تو علمی مضامین پر لیکچر دوسرے اخبار کا اجراء جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہوتا کہ ہندوستانیوں کے خیالات حکومت اور حکومت کی پالیسی سے عوام واقف ہوسکیں سر سید جب علی گڑھ آئے تو سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔۳۰رمارچ ۱۸۶۶ء کو اس سوسائٹی نے ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کا اجراء کیا۔تعلیم کے دائرہ کو عام کرنے کے لیے سر سید نے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کی بنیاد ڈالی، ملک بھر میں اس کے اجلاس منعقد ہوتے اور تعلیم کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی جاتی۔

علی گڑھ آنے کے بعد اب سر سید کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ورناکلر یونیورسٹی قائم کی جائے۔سائنٹفک سوسائٹی کے قیام سے اردو میں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ حل ہونے کی امید تھی، چناں چہ ۱۸۶۶ء میں سر سید نے ''برٹش انڈین اسوسی ایشن'' قائم کی جس نے ۱۸۶۷ء میں حکومت کو ایک ''ورناکلر یونیورسٹی'' کی تجویز پیش کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ دیسی زبان میں اعلیٰ تعلیم کا ادارہ قائم کیا جائے اس کے فوائد بھی تفصیل سے بتائے گئے، اس کا جواب حکومت کے سکریٹری جناب ''ای.سی.بیلی'' نے ۵رستمبر ۱۸۶۷ء کو دیا کہ دیسی زبان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لوازمات نہیں ہیں صرف کتابوں کا ترجمہ یونیوسٹی میں داخل کرنا مناسب نہ ہوگا اور اتنی بڑی آبادی والے ملک کی تعلیم کے لیے حکومت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ پورا خرچ برداشت کرے، اس خط وکتابت کے بعد ورناکلر یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ ملتوی ہوگیا اور سر سید لندن کی سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ سرسید کے خیالات میں بھی تبدیلی آگئی اور مادری زبان میں تعلیم دینے کے بجائے انگریزی زبان میں تعلیم دینے کی حمایت کرنے لگے وہ سمجھ رہے تھے کہ صرف تراجم کے ذریعہ ہی مغربی علوم وفنون میں وہ دسترس حاصل نہیں ہوسکتا جو براہِ راست انگریزی زبان میں حاصل ہوگا اور جس تیزی سے سائنسی وسماجی علوم یورپ میں ترقی پارہے تھے تراجم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، لندن سے واپسی پر ایسے تعلیم گاہ کے خواہاں تھے جو آکسفورڈ اور کیمبرج کا مقابلہ کرسکے، جس کا اظہار انھوں نے اس خط میں کیا ہے جو حیدرآباد دکن کے ''سالارِ جنگ'' کو ۵/اگست ۱۸۷۲ء کو ''محمڈن اورینٹل کالج کی فاؤنڈیشن کمیٹی'' کے سکریٹری کی حیثیت سے لکھا تھا (۱۹)۔

اب وہ وقت آگیا تھا کہ سرسید اپنے بیش بہا تجربات لندن کے سفر کے مشاہدات، انجمنوں، سوسائٹیوں، اسکولوں، اخبارات، رسائل وتصانیف کے ذریعہ کی گئی خدمات کا نچوڑ اور انگریزی حکومت سے تعلق کا فائدہ اٹھا کر ہندوستان میں جدید علوم کے فروغ اور اعلیٰ سائنسی تعلیم کے لیے جو انھوں نے خواب دیکھا تھا اسے حقیقت میں بدل دیں، چناں چہ ۱۸۷۰ء میں برطانیہ سے واپسی پر سرسید نے ''کمیٹی خواستگار ترقیٔ تعلیم مسلمانان'' قائم کی اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک کالج کھولا جائے، حکومتِ ہند نے اس تجویز کو پسند کیا، فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مجوزہ کالج کے متعلق مکمل اسکیم پیش کی، سرسید اس زمانے میں بنارس میں تھے، مولوی سمیع اللہ نے انتظامات کو دیکھا، بالآخر ۲۴/مئی ۱۸۷۵ء کو ''سر ولیم میور'' کے ہاتھوں ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' علی گڑھ کا قیام عمل میں آیا، جولائی ۱۸۷۶ء میں سرسید سبکدوش ہوکر علی گڑھ آگئے۔ ۸/جنوری ۱۸۷۷ء کو ''لارڈ لیٹن'' کے ہاتھوں کالج کا باقاعدہ سنگِ بنیاد رکھا گیا، سرسید اپنے انتقال (۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) تک کالج کی تعمیری اور تعلیمی کام کی نگرانی کرتے رہے، تہذیب الاخلاق پرچہ میں مضامین بھی لکھتے رہے، ہندوستانی وانگریز اساتذہ کی خدمات کالج کے لیے لی گئیں، بہترین صلاحیتوں والے یہ اساتذہ ہندوستانی طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ذہنی تربیت بھی کرتے رہے، ۱۹۲۰ء میں حکومت نے اسے یونیورسٹی کا درجہ دے دیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے آج تک یہ لاکھوں ہندو بیرون ہند کی کئی نسلوں کے مستقبل کو سنوار چکی ہے اور سنوارتی رہے گی۔

جو ابر یہاں سے اٹھے گا ۔۔۔ وہ سارے جہاں پر برسے گا

ہر جوئے رواں پر برسے گا ۔۔۔ ہر دشت ودمن پر برسے گا

خود اپنے چمن پر برسے گا ۔۔۔ غیروں کے چمن پر برسے گا

یہ ابر ہمیشہ برسا ہے ۔۔۔ یہ ابر ہمیشہ برسے گا

بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوستانی سیاست میں تبدیلی آنا شروع ہوجاتی ہے، دراصل اس کی پہلی ربع صدی میں عالمی پیمانے پر کئی واقعات رونما ہوئے، سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف خود یوروپ میں بحثیں شروع ہوگئیں ایک بڑے مفکر ''کارل مارکس'' نے اس کے خلاف اشتراکیت (کمیونزم) کا نظریہ پیش کیا اس کی کتاب ''داس کیپٹل'' نے پورے ایک عہد کو متاثر کیا حتی کہ ''ولادیمیرالیچ لینن'' نے روس میں اشتراکی حکومت قائم کردی اس طرح یوروپ دو بلاک میں تقسیم ہوگیا، ''اشتراکی بلاک'' اور ''سرمایہ دارانہ بلاک'' دوسرا اہم واقعہ عالمی جنگ کا شروع ہونا ہے، اس صدی میں لڑی گئی دو عالمی جنگوں میں سے اس پہلی جنگ میں ''یوروپ کے مرد بیمار'' ''خلافتِ عثمانیہ'' ترکی کو بھی گھسیٹ لیا گیا، جنگ کے خاتمہ پر صدیوں سے قائم خلافتِ عثمانیہ کو ختم کردیا گیا اور اس کے حصے بخرے کرکے یورپ نے بندر بانٹ کا کھیل کھیلا، یہی نہیں ۱۹۱۹ء میں ارضِ مقدس میں ''تل ابیب'' شہر کی بنیاد رکھ دی گئی ان دو واقعات نے پورے عالمِ اسلام کو صدمہ سے دوچار کردیا، اقبال نے اس موقعہ پر کہا تھا۔

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

میں سمجھتا ہوں سب سے زیادہ صدمہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہوا پوری دنیا میں شاید ہندوستانی مسلمان ہی تھے جنھوں نے ملک گیر پیمانے پر خلافت کی بحالی کے لیے ''تحریک خلافت'' شروع کی جس کے سرخیل محمد علی جوہر تھے، ان کی ماں کے کہے ہوئے الفاظ ہر خاص وعام کی زبان پر تھے، ''جان بیٹا خلافت پہ دیدو''۔

گاندھی جی کو بھی ہندوستانی سیاست میں قدم رکھے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، ان کے

آنے کے بعد ''انڈین نیشنل کانگریس' ملک کی سب سے بڑی عوامی پارٹی بن کر سامنے آتی ہے، تحریکِ خلافت میں گاندھی جی اپنے تمام مداحوں اور ہم خیالوں کے ساتھ برابر کے شریک رہے اور ہندو مسلم اتحاد کا وہ نمونہ ملک نے پھر کبھی نہیں دیکھا، ''عدمِ تشدد'' کا پیغام پہنچانے والے مہاتما گاندھی نے انگریزوں سے ''عدمِ تعاون'' کی تحریک شروع کی اس وقت وہ ولولہ اور جذبہ تھا کہ انگریز حکومت کے ملازمین اساتذہ، جج اور وکلاء وغیرہ نے استعفیٰ دے دیا، برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا گیا یونیورسٹیوں اور کالجوں سے اساتذہ اور طلباء نکل پڑے، سب کی نظریں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر لگی ہوئی تھیں، وہاں کے اربابِ حل وعقد پس وپیش میں تھے مگر طلباء کا جذبہ قابل قدر تھا، انھیں علی برادران جیسے قائد مل گئے عمائدین ملت نے فیصلہ کیا کہ ان طلباء کو لے کر ایک الگ ادارہ کی بنیاد رکھی جائے جو انھیں اصولوں پر قائم ہو، شیخ الہند مولانا محمود الحسن چند مہینہ پہلے ہی مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان تشریف لائے تھے، سخت علالت کے باوجود وہ علی گڑھ تشریف لائے اور وہ تاریخی خطبۂ صدارت پیش کیا جس کا ہر ہر حرف قابل غور ہے، یہی اس ادارہ کا خطبہ تاسیس بھی ہے جسے ہم ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کے نام سے جانتے ہیں۔ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کا وہ تاریخی دن ہے جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ہاتھوں علی گڑھ میں ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی بنیاد رکھی گئی۔

اس موقعہ پر آپ نے فرمایا تھا:

> ''آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا'' (۲۰)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہند ایسے ادارے کی بنیاد رکھ رہے ہیں جو دیوبند جیسے اسلامی علوم نہیں بلکہ جدید علوم کا ادارہ ہوگا مگر کس مقصد سے؟ وہی حریت کا جذبہ کارفرما تھا کہ جس میں اپنی زندگی داؤ پر لگائی، قید وبند میں رہے، قربانیاں دیں اب منشاء یہ ہے کہ دینی ادارے کے بجائے عصری علوم کا ایسا ادارہ وجود میں آئے جو ان کے مشن پر پورا اتر سکے لہٰذا جامعہ کی تاسیس پر بڑے درد سے کہا تھا۔

''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے
غمخوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں
میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند
مخلصین احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا'' (۲۱)۔

الغرض علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھ دی گئی اس کے تاریخی پس منظر اور مقاصد کا ذکر اوپر آچکا ملک کے اٹھارہ نامور شخصیات کو تاسیسی ممبر بنایا گیا ان میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، مولانا شبیر احمد عثمانی اور سیف الدین کچلو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء کو حکیم اجمل خاں پہلے چانسلر اور محمد علی جوہر پہلے وائس چانسلر بنائے گئے، تقریباً پانچ سالوں کے بعد ۱۹۲۵ء میں اسے علی گڑھ سے ''قرول باغ'' (دہلی) منتقل کیا گیا۔

ہندوستان میں ''عدم تعاون'' کی تحریک ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کی اہم محرک ہے اس لیے حکومت سے تعاون کا سوال ہی نہیں تھا، لہٰذا جامعہ کے اساتذہ کا ایثار اور قربانی اس کا امتیازی وصف رہا، یہ حضرات ہندوستان اور یوروپ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کیے ہوئے تھے، پھر معمولی مشاہروں پر جامعہ کے لیے اپنی خدمات پیش کیں حالاں کہ ان کے لیے ہمیشہ اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے، ان میں تین لوگوں کے نام نہایت اہم ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر محمد مجیب، یورپ سے لوٹ کر ان تینوں نے فروری ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے کام کرنا شروع کیا، دوسری جانب دہلی کی دو قابل احترام شخصیات ایسی تھیں جو مالی بحران کے موقعہ پر ہمیشہ ساتھ دیتی تھیں اور ہر موڑ پر بھرپور مالی تعاون کرتے، یہ تھے حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ان حضرات کے انتقال کے بعد جامعہ مالی بحران سے دوچار ہوا تو ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے بیدار مغز اور بے لوث خادم کی تحریک پر تقریباً بیس برسوں تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نوجوان اساتذہ نہایت معمولی مشاہرہ پر کام کرتے رہے، مصنفین کی حوصلہ افزائی اور کتابوں کی اشاعت کی غرض سے ۱۹۲۸ء میں ''مکتبہ جامعہ لمیٹڈ'' قائم ہوا، جگہ کی تنگی کے

پیش نظر جامعہ یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو قرول باغ سے اوکھلا (نئی دہلی) میں منتقل ہوا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اپنے معتمد خاص مولانا عبید اللہ سندھی کو ۱۹۱۵ء میں بیرون ملک روانہ کیا تھا، ۲۴ر سالوں کے بعد ۱۹۳۹ء میں جب وہ ہندوستان لوٹے تو ڈاکٹر حسین نے انھیں شاہ ولی اللہ کے نظریات کو فروغ دینے کی غرض سے جامعہ میں کا کام کرنے کا موقع دیا۔ آزادی کے بعد ۱۹۶۲ء میں حکومتِ ہند نے اسے Deemed to be University کا درجہ دیا اور دسمبر ۱۹۸۸ء میں اسے مرکزی یونیورسٹی کا مقام دے دیا گیا۔

ان تینوں اداروں کی غرض وغایت، برطانوی ہند میں انگریز مسلم ثقافت اور ان اداروں کا کردار، مشرقی ومغربی علوم اور اس کے تئیں جداگانہ خیالات، ہر ایک کی افادیت واہمیت کا ایک اجمالی خاکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، آخر میں اس کے جو نتائج میں نے سمجھے ہیں اس سے ہر کسی کو اتفاق یا اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔

دراصل یہ تینوں ادارے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم ان کی پسماندگی کو دور کرنے اور ملک و ملت کی خدمت کے جذبے کے تحت وجود میں آئے، ان مشترکہ مقاصد کے ہوتے ہوئے بھی روزِ اوّل سے ان تینوں کی جداگانہ حیثیت اور انفرادیت رہی ہے دیوبند تو انگریزی ثقافت کے اثرات کو زائل کرنے کا کام کرتا رہا ہے، جب کہ علی گڑھ انگریزی ثقافت کو ہندوستانی مسلم ثقافت سے ہم آہنگ کرنے کی دعوت دیتا رہا، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا دور تھوڑا بعد کا ہے، اس وقت سوال ثقافتی تحفظ یا تہذیبی تصادم یا پھر مشرقی یا مغربی علوم کی تحصیل کا نہیں تھا، بلکہ انگریزی حکومت سے تعاون یا عدم تعاون کا تھا، سودیشی حکومت اور وطن پرستی کا تھا، مذہبی منافرت یا فرقہ واریت ملک کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا، آر ایس ایس اور مسلم لیگ جیسی تنظیموں نے اتحاد وسالمیت کا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا اس تناظر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کردار کی بڑی اہمیت ہے، جس نے ایک طرف سادگی اور قربانی کے جذبہ سے کام کرنا سکھایا تو دوسری جانب انگریزی حکومت کے تعاون سے گریز کرتے ہوئے ملک میں اتحاد و وطن پرستی کے جذبہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی، جامعہ کی بنیاد رکھنے والوں میں تقریباً تمام لوگ ایک ہندوستانی قومی نظریہ پر یقین رکھتے تھے، خود شیخ الہند جنھوں نے جامعہ کا خطبۂ

تاسیس پڑھا دیوبند کے اوّلین طالب علم اور ایک بڑی قومی تحریک کے بانی تھے، یہی وجہ ہے کہ دیوبند اور جامعہ نے دوقومی نظریہ کی سختی سے تردید کی ملک کی تقسیم کا مسئلہ جب سامنے آیا تو ان دونوں اداروں نے اس کی پرزور مخالفت کی، اس طرح دیوبند اور جامعہ کے فکری رویہ میں مطابقت پائی جاتی ہے، اب رہی بات آزاد ہندوستان میں ان کی کارکردگی کی تو دیوبند کا مسئلہ الگ ہے وہاں علم کو علم کے لیے پڑھایا جاتا ہے وہ اپنے اپنے علمی میدان میں کام کررہے ہیں، عوام الناس کی دینی ضرورت پوری ہورہی ہے یہاں پر آکر علی گڑھ اور جامعہ کا نصب العین ایک ہوجاتا ہے، یہ سچ ہے کہ سرسید کے سامنے مسلمانوں کا معاشی مسئلہ اہم تھا اس لیے ان کی خواہش تھی کہ جدید علوم حاصل کرکے مسلمان اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتوں کو حاصل کریں مگر ان کا یہ بھی دیرینہ خواب تھا کہ مسلمانوں میں جو علمی انحطاط اور فکری جمود طاری ہے وہ ٹوٹے۔ تحقیقی اور اجتہادی رویہ کے بجائے جو تقلیدی مزاج بن گیا ہے وہ بھی ختم ہو اس کے لیے مختلف میدانوں میں بڑے بڑے علمی و تحقیقی کارناموں کی ضرورت تھی اور یہ کام ''ایم اے او'' کالج میں ہوسکتا تھا، مگر تمام تر سہولتوں اور مواقع کے باوجود ایسے علمی کاموں کا ذوق علی گڑھ میں پیدا نہ ہوسکا جو اس معاملہ میں یورپ کے کسی ادارہ کا مقابلہ کرسکے۔ صرف معاشی آسودگی اور ذاتی ترقی ہی ہر ایک کا مقصد ہے اگر واقعی سرسید سے محبت ہے تو ان کی اس تمنا کو پورا کرنا چاہیے خود ان کی زندگی کا نمونہ ہمارے سامنے ہے کہ باضابطہ کسی مدرسہ یا کالج میں تعلیم نہ پانے کے باوجود وہ ایسے بڑے بڑے علمی کام کرگیا، ہم صرف ''سرسید ڈے'' کا جشن مناکر دل کو منالیتے ہیں کہ ہمیں سرسید سے محبت ہے، ایسا ہی کچھ حال جامعہ کا بھی ہے۔

یہ نتائج اور حقائق ہیں جو میں نے پیش کیے، آزاد ہندوستان میں حکومتِ ہند نے اقلیتوں کی تعلیم کے لیے بڑی مراعات دی ہیں اپنی مرضی کے خودمختار تعلیمی ادارے قائم کرسکتے ہیں، حکومت انھیں پورا تعاون دیتی رہے گی، چناں چہ ملک میں آزادی کے بعد مسلمانوں نے بڑی تعداد میں اپنے ادارے قائم کیے اور مدارس بھی بڑی تعداد میں قائم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ مگر کیا کوئی بڑا علمی کام ہورہا ہے، ماضی کے یہ ادارے نہیں کرسکے، تو اب صرف صارفیت، بازار اور اشیاء کے دور

میں کیا ہوگا، اداروں کا مقصد یا کام کا نہج کچھ بھی ہو چلئے تعلیم کی بات کرتے ہیں تو ان کا معیار وہ نہیں ہے جو ملک کے دیگر اداروں کا ہے، اس کی بنیادی وجہ مسلمان قوم ہندوستان میں دیگر اقوام سے پیچھے ہوگئی ہے، صرف اپنے تعلیمی ادارے قائم کرتے چلے جانے سے یہ پسماندگی دور نہیں ہوگی کیوں کہ انھیں اپنے اداروں اور کالجوں میں دوسری اقوام کے طلباء سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا اور ملنے جلنے کا اتفاق کم ہی ہوتا ہے اس لیے ان کی تعلیمی حالت ترقی نہیں کرتی پھر کیا ہونا چاہیے؟ میرے خیال میں اب خود اپنے کالج یا ادارے قائم کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ سرکاری اداروں اور ملک کے دیگر معیاری تعلیم گاہوں میں مسلمان طلباء کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع کیسے فراہم کیا جائے تا کہ ان کے ذہن میں کشادگی پیدا ہو اور یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ ان کا مقابلہ کتنے اور کیسے طلباء سے ہے، آزادی کے بعد اقلیتوں کے بڑی تعداد میں تعلیمی اداروں کے وجود میں آنے کے باوجود تعلیمی پسماندگی برقرار ہے، لہٰذا اب ہمیں چاہیے کہ اپنے ادارے کھولنے کے لیے حکومت کی گرانڈ منظور کرانے کے بجائے حکومت سے پرزور اس بات کا مطالبہ کیا جائے کہ ملک کے تمام اہم یونیورسٹیوں اور پیشہ وارانہ اداروں میں مسلمان طلباء کے داخلے کے لیے مراعات دی جائیں اور سہولتیں فراہم کی جائیں تبھی ہماری تعلیمی پسماندگی اور اسی تناظر میں ہر طرح کی تنزلی کو دور کیا جاسکتا ہے ان تینوں اداروں کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تجویز آپ کے سامنے پیش کروں اور پھر اسے ایک تحریک کی شکل دے دی جائے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ۲۰۰۳) ص:۷۵۔

(۲) سید محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند (دیوبند: مکتبہ دار العلوم، ۱۹۹۲ء) ص:۲۷۔

(۳) شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی (دیوبند: دار الاشاعت) ص:۱۹۱۔

(۴) جونپور نامہ، گورنمنٹ گزٹ: ص:۴۔

(۵) مولوی بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت دہلی، جلد دوم (دہلی: اردو اکیڈمی گھٹا مسجد دریا گنج، ۱۹۹۰ء)

ص:۱۱۳۔

(۶) عنایت اللہ فرنگی محلی، تذکرۂ علمائے فرنگی محل

(۷) مولوی بشیر الدین احمد واقعاتِ دار الحکومت دہلی، جلد دوم (دہلی، اردو اکیڈمی گھٹا مسجد دریا گنج، ۱۹۹۰ء)

ص:۱۷۳۔

(۸) سید محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند (دیوبند: مکتبہ دار العلوم، ۱۹۹۲ء) ص:۱۴۱۔

(۹) سید محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند (دیوبند: مکتبہ دار العلوم، ۱۹۹۲ء) ص:۱۴۱۔

(۱۰) اخبار الجمعیۃ دہلی (بلی ماران دہلی: ۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء)

(۱۱) سید محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند، جلد اوّل (دیوبند: مکتبہ دار العلوم، ۱۹۹۲ء) ص:۱۵۵۔

(۱۲) سید محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند، جلد اوّل (دیوبند: مکتبہ دار العلوم، ۱۹۹۲ء) ص:۱۵۵۔

(۱۳) مولانا قاسم نانوتوی، رسالہ تصفیۃ العقائد (دیوبند: کتب خانہ عزیزیہ) ص:۵

(۱۴) سید محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند، جلد اوّل (دیوبند: مکتبہ دار العلوم، ۱۹۹۲ء) ص:......

(۱۵) اسیر ادروی، مولانا قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے (دیوبند: شیخ الہند اکیڈمی، ۱۹۹۷ء) ص:۱۶۲۔

(۱۶) (مجموعہ لیکچرز و اسپیز: مرتبہ محمد الدین گجراتی، لاہور) ص:۲۹۸۔

(۱۷) نور الحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس) ص:۱۷۶۔

(۱۸) افتخار عالم خاں، سرسید اور سائنٹفک سوسائٹی (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) ص:۱۷۔

(۱۹) تفصیل کے لیے دیکھئے فکر و نظر علی گڑھ، شمارہ اپریل ۱۹۶۵ء

☆☆☆

FIKRI ZAVIE

by

Samsul Huda Dariyabadi

ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ شعبہ کے بانیان میں ان کا شمار ہوتا ہے اور شعبہ کی تشکیل میں ان کا بھی حصہ رہا ہے۔ مثلاً شعبہ میں انھیں کی نگرانی میں عزیزی الطاف آہنگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے شعبہ نیز یونیورسٹی کے پہلے اسکالر ٹھہرے۔ یہ خود بھی تحقیقی مزاج کے حامل ہیں ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''قدیم دہلی کالج'' ان کی تحقیقی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ انہوں نے تحقیق سے اپنے شغف کو برقرار رکھا ہے اور مضامین لکھتے رہتے ہیں جو شائع بھی ہوا کرتے ہیں۔ وہی مضامین کتابی صورت میں بعنوان ''فکری زاویے'' آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

یہ مضامین اپنی دو خوبیوں کی وجہ سے متاثر کرتے ہیں: ایک ان کا اختصار، دوسری ان کے پیچھے کارفرما مذہبی احساس، یہ مضامین اپنی اختصار کے باوجود اپنے دامن میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور رکھتے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کو کچھ نہ کچھ پانے کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف تشنگی کا احساس بھی بڑھ جاتا ہے۔ چونکہ ہدیٰ صاحب مذہبی فکر کے حامل ہیں سو یہ فکر ان کے تحقیقی مزاج کا حصہ ہے۔ اسی لئے ان کے زیادہ تر مضامین مذہبی اداروں اور مذہبی شخصیات سے متعلق ہیں، خوشی اس بات کی ہے کہ انہوں نے اپنے تحقیقی مزاج اور طبعی رجحان کی مدد سے اردو زبان و ادب کے تئیں ان مذہبی شخصیات اور اداروں کی خدمات کو نمایاں کیا ہے جن سے بہت سے حضرات ناواقف ہیں۔ مجھے امید ہے وہ اپنے طبعی رجحان اور تحقیقی مزاج کو اسی طرح کام میں لاتے رہیں گے تو یہ ان کے اور اردو زبان و ادب کے حق میں بہتر ہوگا۔

پروفیسر خالد سعید

شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE

www.ephbooks.com